إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مئی ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۴ء/ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ

مشمولات

○فکر و نظر

جنگِ غلاماں	مدیر	۴

○تعلیم و تربیت

اسلامی سکول ناکام کیوں ہیں؟	ڈاکٹر محمد امین	۵
نسل نو پر مغربی تعلیم کے اثرات (آخری قسط)	سید خالد جامعی	۱۱
مخلوط تعلیم ۔مضمرات، خدشات اور نقصانات	پروفیسر ملک محمد حسین	۲۲
جدید تعلیم کی درسگاہیں یا قتل گاہیں	محمد دین جوہر	۳۱
تعلیم کوئی مسئلہ ہی نہیں!	اللہ داد نظامی	۳۹
دینی مدارس کا نصاب و نظام محتاج نظرثانی ہے	مولانا محمد خاں شیرانی	۴۰

○غلبۂ دین

سیاسی جدوجہد نہ مسلح جدوجہد غلبۂ اسلام بذریعہ دعوت وصبر	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	۴۱

○اسلام اور مغرب

مادی ترقی کا لازمی نتیجہ ۔شناخت کا بحران	محمد ظفر اقبال	۴۸

○تبصرۂ کتب

فکر و نظر

جنگِ غلاماں

حامد میر پر حملہ، جیو/جنگ کی آئی ایس آئی چیف کے خلاف محاذ آرائی، فوج کا جوابی وار، اس کے حق میں ریلیاں، پھر جیو کی طرف سے توہین اہلِ بیت، عوام میں اشتعال لیکن حکومت کی طرف سے خاموشی اور جیو کی بالواسطہ حمایت...... اس کے باوجود کہ یہ مخاصمت اسے ماضی میں ڈس چکی ہے۔

میڈیا، فوج اور حکومت ۔ ان تینوں میں ایک قدر مشترک ہے: امریکہ کی غلامی ۔ ہماری حکومت اور فوج کا موقف پہلے دن سے یہ ہے کہ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ (دراصل مسلم امت کے خلاف جنگ) ان کی اپنی جنگ ہے؛ اور میڈیا ان کا حمایتی ہے۔

ان اداروں کے کچھ اپنے خصوصی امتیازات بھی ہیں مثلاً ہمارا میڈیا (خصوصاً جیو گروپ) ناچ گانے اور فحاشی و عریانی کے ذریعے مغربی اور ہندو کلچر کو پاکستان میں فروغ دے رہا ہے اور اسلامی اقدار تباہ کر کے اور قوم کے اخلاق بگاڑ کر سیکولرزم اور لادینیت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ پاکستانی مفادات کے مقابلے میں انڈو امریکن لابی کو پروموٹ کر رہا ہے لیکن حکومت (اور فوج) خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔

فوج ملک کے اندر آپریشن کرتی ہے اور اس کی ایجنسیاں جس کو چاہتی ہیں اٹھا لے جاتی ہیں، عدالتیں چیخ چیخ کر تھک گئی ہیں لیکن حکومت بے حس رہتی ہے۔

ہماری حکومت پرویز مشرف (جسے عصر حاضر کا میر جعفر کہا جاتا ہے) کے بعد دوسری سول حکومت ہے لیکن امریکہ و یورپ کے حوالے سے ابھی تک یہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی نہیں کر سکی۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف میڈیا پر جو چاہے ہوتا رہے اس مسلم لیگی حکومت کی خوبی یہ ہے کہ یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی، بے حرکت رہتی ہے۔

پھر یہ شور شرابا کیا ہے؟ ہمیں تو سمجھ نہیں آتی سوائے اس کے کہ یہ جنگِ غلاماں ہے۔ جی ہاں! یہ غلاموں کی جنگ ہے۔ کوئی چھوٹا غلام، کوئی بڑا۔ ذاتی اور گروہی مفادات کی جنگ، حصہ رسدی کی جنگ، رشک و حسد اور امریکی کی غلامی کی دوڑ میں آگے نکلنے کی جنگ......

انا للہ وانا الیہ راجعون

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں؟

البرہان نے پچھلے شمارے میں کراچی کے دانشور سید خالد جامعی صاحب ، تعلیمی مشاورت و تربیت کے ادارے'ایجوکیشنل ریسورس ڈویلپمنٹ سنٹر'(ERDC)[اس طویل انگریزی نام پہ قربان]اور انگلش میڈیم اسلامی سکولوں کے ڈائریکٹرز، پرنسپلز کے ساتھ ایک فکری نشست کا ذکر کیا تھا جس میں سکول سربراہوں نے شکوہ کیا کہ ان کی ''اسلامی'' کوششوں کے باوجود ان کے فارغ التحصیل طلبہ مغربی تہذیب کے شائق اور اس کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ سید جامعی صاحب نے دیگ کے ایک دانے کو چکھنے کے مصداق ان سکولوں کی دو نصابی کتابوں کا تحلیلی تجزیہ کیا (پہلی قسط البرہان کے اپریل کے شمارے میں چھپی اور آخری قسط موجودہ شمارے میں)اور یہ ثابت کیا کہ یہ نصاب اسلامی تعلیمات کی نفی کرتا ہے اور مغربی تہذیب کے اصول و اقدار کو پروموٹ کرتا ہے اور جن سکولوں میں ایسا مغرب پرستانہ نصاب ہو وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ مغرب زدہ ہی ہونے چاہئیں۔اس بارے میں البرہان بھی کچھ گزارشات اسلامی سکولوں اور قارئین کے غور و فکر کے لیے پیش کرنا چاہتا ہے: مدیر

کسی بھی نظام تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کا معیار کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ وہ نظام تعلیم معاشرے کے آئیڈیلز کے مطابق افراد تیار کررہا ہے یا نہیں؟ پاکستان کا موجودہ نظامِ تعلیم اس لحاظ سے ناکام سمجھا جائے گا کہ وہ ایسا فرد تیار نہیں کررہا جو مسلم معاشرے کے آئیڈیلز یا قرآن کو مطلوب ہے۔راقم کے عمر بھر کے غور و فکر اور مطالعہ کے مطابق عصر حاضر میں صحیح اسلامی نظام تعلیم اور اس سے مطلوب موثر نتائج کے لیے دو اصولوں پر عمل ضروری ہے:

ایک: تعلیم کے سارے اجزاء کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی جائے۔

دوم: تعلیم کے مغربی اصول و اقدار کو ترک کردیا جائے۔

ہمارے تعلیمی حلقوں کی اکثریت ان دونوں اصولوں پر عمل کے لیے تیار نہیں۔بعض اسلامی ذہن کے لوگ تبرکاً پہلے اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے لیے بعض Showy قسم کے اقدامات کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں جیسے قرآن ناظرہ و حفظ کا اہتمام یا مسنون دعائیں یاد کرانا......وغیرہ لیکن اس کے سنجیدہ

تقاضوں پر عمل کرنے کو تیار نہیں جس سے بچوں کی صحیح ذہن سازی اور تربیت ہو یعنی تعلیم کے سارے اجزاء (تعلیمی انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ، نصاب، اور ہم نصابی سرگرمیوں) کی اسلامی تعلیمات کے مطابق تشکیل و تنظیم و تدوینِ نو کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچہ تو پہلے ہی مغرب زدہ ہے۔

جہاں تک دوسرے اصول کا تعلق ہے یعنی تعلیم کے مغربی تصورات کو ترک کر دیا جائے تو خواہ سیکولر لوگ ہوں یا دین دار، کوئی اس اصول کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں حالانکہ جس کلمے **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کو پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں۔ یعنی جب تک ماسوا اللہ کا انکار نہ کیا جائے اللہ کو ماننا بے معنی ہے۔

ہمارے مغربی تعلیم کے اصول و اقدار کو ترک کرنے پر اصرار کے تین بڑے سبب ہیں☆:

ایک: مغربی فکر و تہذیب اپنی اصل میں الحادی ہے۔ مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو جن اصولوں پر مبنی ہے وہ ہیں: ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپیریسزم وغیرہ۔ ان اصولوں کا مطلب ہے خدا کی خدائی کی نفی، انسان کا اللہ کا عبد ہونے سے انکار اور اپنے خود مختار بلکہ مختار مطلق ہونے کا دعویٰ، آخرت اور وحی کا انکار......ظاہر ہے ایک مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے، ان افکار اور اس ورلڈ ویو کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟

دوسرے: قرآن و حدیث مسلمانوں کو علی الاعلان اور واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ ان کے بدخواہ اور دشمن ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہے کہ وہ انہیں دین سے پھیر دیں۔

تیسرے: یہود و نصاری کی اسلام اور مسلم دشمنی ایک عریاں اور نا قابل انکار حقیقت ہے۔ صلیبی جنگیں، مسلمانوں کا قتل عام، اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ، مسلم علاقوں پر قبضہ، ان کی املاک کی لوٹ مار، ان کی فوجی قوت کو کچلنا، ان کے ریاستی اداروں کی توڑ پھوڑ اور مغربی تہذیب کے مطابق ان کی تشکیل نو، مسلمانوں کو ذہنی غلام بنائے رکھنے کے لیے ان کی کوششیں، نو آزاد مسلم ممالک کی پالیسیوں میں دخل اندازی......اگر مسلمانوں کو یہ تاریخ بھول گئی ہے تو آج جو کچھ امریکہ و یورپ ان کے ساتھ کر رہے ہیں کیا وہ بصیرت و بصارت دونوں سے محروم ہو گئے ہیں کہ اسے نہیں دیکھ سکتے؟ کیا وہ اپنے مشاہدے کو بھی جھٹلانا چاہتے ہیں کہ ہماری آنکھوں دیکھتے اہل مغرب نے عراق، افغانستان، لیبیا، بوسنیا، الجزائر اور جنوبی سوڈان میں کیا کیا؟ اور پاکستان، یمن، مصر، مالی، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، فلپین، چینی ترکستان اور روسی داغستان میں وہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا کیا حشر کر رہے ہیں؟

☆ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'

اس سب کے باوجود اگر مسلمان مغرب وفکر وتہذیب سے مرعوب ہیں اور دنیا میں ترقی اور کامیابی کا نسخہ یہی سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو مغربی طرز کی تعلیم دلوائیں تو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ دینی حمیت اور عقل وبصیرت سے محروم ہیں اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ بہرحال اگر کوئی چاہے کہ وہ تعلیم میں مغربی اثرات سے بچے اور غلام ذہنوں کی حامل مغرب زدہ نسل تیار کرنے کے گناہ میں شریک نہ ہو تو اسے چاہیے کہ تعلیم میں مغربی اصول واقدار کو رد کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نسخے پر عمل کرے:

۱۔ تعلیم کو تجارت نہ سمجھے ۲۔انگریزی میڈیم سے باز آجائے۔

۳۔ مخلوط تعلیم ختم کردے

۴۔غیر مسلموں،غیر پاکستانیوں اور مغرب زدہ مسلمان پاکستانیوں کا بنایا ہوا نصاب ترک کردے۔

۵۔یورپی ممالک کا نصاب اور امتحان (مثلاً اواور اے لیول) ترک کردے۔

۶۔ موجودہ ہم نصابی سرگرمیاں مغربی یونیفارم،ٹیبلو، ڈرامے، فیشن شوز، مینا بازار، کنسرٹ، میوزک کلاسیں......وغیرہ ترک کردے۔

اور یہ سب تو سلبی [یعنی 'نفی' پر مبنی] تجاویز تھیں، اگر بچوں کو باعمل مسلمان بنانا ہے تو کچھ مثبت [یعنی 'اثبات' پر مبنی] تجاویز پر عمل بھی ضروری ہے مثلاً:

۱۔طلبہ کو اپنی زبان،اپنے لباس،اپنے دین،اپنی اقدار اور اپنی تاریخ پر فخر کرنا سکھایا جائے۔

۲۔ ان کی اسلامی تربیت کی جائے تاکہ وہ کل کو اچھے مسلمان ثابت ہوں،تعلیمی ادارے کی انتظامیہ اور اساتذہ کا سب سے بڑا کام اور ہدف یہی ہونا چاہیے۔

۳۔تعلیمی انتظامیہ اور اساتذہ کی صرف پیشہ ورانہ تربیت نہ کی جائے بلکہ ان کی نظریاتی تربیت بھی کی جائے تاکہ انہیں پتہ ہو کہ ان کا سب سے بڑا ہدف بچوں کی اسلامی تربیت کرنا ہے۔

۴۔ نصابی کتب از سر نو مدون کی جائیں۔ اسلامیات کا موجودہ نصاب ناکارہ اور ناکافی ہے، اسے موثر بنایا جائے۔سوشل سائنسز اسلامی تناظر میں از سر نو مدوّن کی جائیں اور نیچرل سائنسز اس طرح مرتب کی جائیں کہ اس سے مغربی سائنس وٹیکنالوجی سے مرعوبیت پیدا نہ ہو۔

کیا یہ قابل عمل ہے؟

جس سوچ کا ہم نے سطور سابقہ میں اظہار کیا ہے اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں کچھ

اشکالات پیش کیے جاتے ہیں۔ایک ان کی طرف سے جنہوں نے سکول تجارتی مقاصد کے لیے کھولے ہوئے ہیں اور ساتھ اسلامی مقاصد بھی رکھتے ہیں۔ان میں دو طرح کے لوگ ہیں: ایک گلی محلے کے وہ سکول جو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ انگلش میڈیم، او اے لیول کے امتحانات، آکسفورڈ کی کتابیں، پینٹ شرٹ، نکٹائی: لڑکیوں کی وی کی پٹی...... یہ سب عوام میں پاپولر ہو چکے ہیں۔اور مارکیٹ کی ڈیمانڈ بن چکے ہیں۔اگر ہم یہ سب نہیں کریں گے تو والدین اپنے بچوں کو ہمارے سکول میں نہیں بھیجیں گے اور ہمارا سکول فیل ہو جائے گا لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ یہ چیزیں اپنے سکول میں آفر کریں۔

ان میں بڑے سکولوں کا ایک گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ایلیٹ کلاس کے بچے ہی اعلیٰ مناصب پر جاتے ہیں اور وہی معاشرے وریاست کے امور میں فیصلے کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیے جو محض مغربی اور جدید نہ ہو بلکہ اسلامی بھی ہو۔وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید مروجہ تعلیم سیکولر ہے اور غیر اسلامی رجحانات رکھتی ہے اور مارکیٹ میں لوگ ایسی ہی تعلیم دے رہے ہیں لہٰذا ان کے مقابلے میں وہ ایسی تعلیم دے کر نیکی کا کام کرنا چاہتے ہیں جو جدید اور مغربی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہو۔وہ قرآن پڑھنا سکھاتے ہیں، حفظ کراتے ہیں، دعائیں یاد کراتے ہیں......وغیرہ وغیرہ اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تعلیم کو اسلامی بنانے اور اسلامی تناظر میں دینے کا فرض ادا کر دیا۔وہ سمجھتے ہیں کہ اچھی فیس لینا ان کا حق بھی ہے اور مجبوری بھی کیونکہ ریاست ان کی مدد نہیں کرتی۔اگر بھاری بھر فیس نہ لی جائے تو لوگ سکول کو غیر معیاری سمجھ کر داخلہ نہیں لیتے اور اگر طلبہ کو اچھی بلڈنگ اور اچھی سہولیات دی جائیں تو بہت خرچ اُٹھتا ہے، اسے کیسے پورا کیا جائے؟ لہٰذا کروڑوں خرچ کرنا اور مہنگی فیس لینا ان کے نزدیک معقول جواز رکھتا ہے۔

دوم: انتہائی قلیل گروہ (سو میں ایک بلکہ شائد ہزار میں ایک) ایسے دینی افراد اور اداروں کا ہے جن کے پیش نظر تجارت نہیں بلکہ وہ جدید تعلیم اسلامی انداز میں دینا چاہتے ہیں تاکہ بچے جب کل عملی زندگی میں جائیں تو دیگر خوبیوں کے ساتھ اچھے مسلمان بھی ہوں، حافظ قرآن ہوں، داڑھی رکھتے ہوں، نماز پڑھتے ہوں......وغیرہ۔گویا جدید تعلیم دینے کے کام کو وہ دینی کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہیں۔

ان اشکالات کے جواب میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ:

سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مغربی طرز کی جدید تعلیم دینا غلط ہے۔مغربی طرز کی تعلیم دینا اور مغربی طرز کا فرد تیار کرنا مغربی معاشرے کے لیے تو موزوں ہو سکتا ہے، اسلامی یا مسلم معاشرے کے لیے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں واضح کیا کہ یہ مغربی قوتوں کا منصوبہ بندی سے

پھیلایا ہوا جال ہے۔ یو ایس ایڈ کو پاکستانی اساتذہ کو تربیت دینے کے لیے امریکہ لے جانے یا یہاں ان کو تربیت دینے سے کیا دلچسپی ہے؟ اقوام متحدہ کے تعلیمی سفیر اور سابق وزیر اعظم برطانیہ گورڈن براؤن کیوں ڈالروں اور پونڈوں کی تھیلیاں لیے پاکستان کے چکر لگا رہے ہیں اور پاکستانی سیاستدان و بیوروکریٹ کمشن کے چکر میں ان کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں؟ دراصل مغربی قوتوں کے سامنے ایک ایجنڈا ہے (امریکی صدر تک ایک سابق پاکستانی وزیر تعلیم زبیدہ جلال کی خدمات کو سراہتے تھے) اور وہ ہے تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو نامسلمان بنانا، ان کو دین و اخلاق سے دور کرنا بلکہ ان کے اخلاق بگاڑنا اور انہیں مغربی تہذیب سے مرعوبیت سکھا کر، اپنی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگ کر انہیں اپنے ڈھب کے آدمی بنانا۔

سوال یہ ہے کہ امریکہ و یورپ کے ان شیطانی منصوبوں پر عمل کرنا اور مسلمانوں کو نامسلمان بنانے کے کام میں ان کی مدد کرنا نیکی اور ثواب کا کام کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو جرم ہے، گناہ ہے، اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں مسلمان بچوں کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ پاکستان میں یہ ماحول خود بخود پیدا نہیں ہو گیا، کروڑوں ڈالر خرچ کر کے پیدا کیا گیا ہے۔ پاکستانی سکولوں، تعلیمی بورڈوں اور ان کے نصابات کی پلاننگ سے ہوا خیزی کی گئی کہ ان کا نصاب فرسودہ ہے، کتابوں کا فنی معیار اچھا نہیں، ٹاٹ سکول تو صدیوں پرانے کلچر کے مظہر ہیں، انہیں بدلنا چاہیے۔ انگریزی میڈیم کو لایا گیا، سی ایس ایس کے امتحانات کی زبان انگریزی رکھی گئی، میٹرک ایف اے پاس کرنے والے کی بجائے او اے لیول والے کو ملازمتوں اور اعلیٰ تعلیم میں ترجیح دی گئی۔ اردو کو قومی و دفتری زبان بنانے سے روکا گیا، پرائیویٹ سیکٹر کو آگے لایا گیا اور ان پر کوئی چیک اور کسی نگرانی کا نظام نہ بننے دیا گیا اور یہ سارے کام ہمارے ہاں کے احمق اور بکاؤ حکمرانوں اور افسر شاہی سے کرائے گئے۔

یہاں تک کہ دینی مدارس کے لیے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ وہ جدید علوم نہ پڑھائیں بلکہ قرآن و حدیث پڑھانے کے نام پر مسجد و مدرسہ کے لیے آدمی پیدا کرتے رہیں تاکہ معاشرہ و ریاست سیکولر، بے دین اور مغرب پرست لوگوں کے ہاتھ میں رہے اور اہل مغرب ان سے اپنے ایجنڈے کے مطابق کام لیتے رہیں......غرض یہ ایک دلدوز کہانی ہے ہم کہاں تک دہرائیں۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ تعلیم کو اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بجائے مغربی فکر و تہذیب کے مطابق دینا جرم ہے، گناہ ہے، حرام ہے، بے عقلی ہے۔ خصوصاً ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں جو تجارتی مقاصد نہیں رکھتے کہ وہ تعلیم میں مغربی تہذیب کی نقالی میں مکھی پہ مکھی نہ ماریں۔ اس تعلیمی نظام کی اصلاح کا سوچیں۔ اسلام کو اپناتے ہوئے اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کو ردّ کرتے ہوئے نصاب تیار کریں، اسی نقطۂ نظر سے اساتذہ کی تربیت کریں، طلبہ کی اسلامی تربیت کا اہتمام کریں، ہم نصابی سرگرمیوں کا آہنگ بدلیں۔ یہ کام حکومتی اقتدار کے بغیر آج بھی

ہوسکتا ہے، کوئی کرنے والا تو ہو؟ یہ بھی ضروری ہے کہ انگریز حکومت کے جبر کی وجہ سے قائم ہوجانے والی تعلیمی ثنویت کو بدلا جائے کیونکہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں کہ یہ دین کی تعلیم اور وہ دنیا کی تعلیم لہٰذا وحدت تعلیم کی اساس پر نئے رول ماڈل ادارے قائم کرنا ناگزیر ہے۔

جن لوگوں نے تجارت کے لیے تعلیمی ادارے کھول رکھے ہیں اور وہ مغرب زدہ تعلیم دے رہے ہیں انہیں چاہیے کہ پیٹ کو ایمان پر ترجیح نہ دیں اور کوئی اور کاروبار کرلیں، ملازمت کرلیں، کسی طرح پیٹ پال لیں لیکن مسلمانوں کو نامسلمان بنانے، غلام نسلیں تیار کرنے اور بچوں کے فکری قتل کے جرم میں ملوث نہ ہوں۔ ان میں سے جو لوگ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ سیکولر لوگ جو تعلیم دے رہے ہیں ان کے مقابلے میں وہ بہتر ہیں کیونکہ وہ بچوں کو قرآن ناظرہ پڑھاتے، حفظ کراتے، دعائیں یاد کراتے اور کچھ نہ کچھ تو کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ دل کو جھوٹی تسلی دینے والی بات ہے۔ آپ کے ہاں سے جو بچے فارغ التحصیل ہورہے ہیں ان پر اسلامیت کا غلبہ نہیں، مغربیت ہی کا غلبہ ہے کیونکہ آپ کا اختیار کردہ مغرب زدہ نصاب، آپ کے اساتذہ، آپ کا تربیت طلبہ کا آہنگ اور ہم نصابی سرگرمیاں......سب مغربی فکر و تہذیب کو پروموٹ کرتی ہیں، اسلام کو نہیں لہٰذا اسلامی مائنڈ سیٹ بنتا ہی نہیں، فکری لحاظ سے یکسو ذہن تیار ہوتا ہی نہیں، مسلم شخصیت و کردار تشکیل پاتے ہی نہیں اور آخری نتیجہ مغربی فکر و تہذیب کے حق میں نکلتا ہے نہ کہ اسلام کے حق میں۔ لہٰذا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا کوئی فائدہ نہیں کہ آپ اسلامی تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر آپ پیسے کے لیے یہ سب کچھ کررہے ہیں، نام اسلام کا استعمال کررہے ہیں اور تعلیم مغرب زدہ دے رہے ہیں تو یہ دین و دنیا دونوں کے خسارے کا سودا ہے، اللہ اس سے بچائے۔ اور اگر آپ کی نیت درست ہے تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اگر اچھی نیت سے برے کام کیے جائیں تو نتیجہ لامحالہ برا ہی نکلے گا اور انجام برا ہی ہوگا کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ نہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں، نہ مسلمانوں کو بلکہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دیتے ہیں......**و ما یخدعون الا انفسھم... و ذلک خسران مبین**۔ آج ضرورت حیلے بہانے مغربی تعلیم کو اپنانے کی نہیں، نہ معمولی درخ اندوزی (Patch work) سے مغرب کی الحادی تعلیم کو اسلامی سمجھ لینے کی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ہے بلکہ ضرورت موجودہ مغرب زدہ نظامِ تعلیم کی موثر اصلاح کی ہے، تعلیم کے سارے اجزاء کی موثر انداز میں تشکیل و تدوین نو کی ہے اور نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کی ہے۔ حکومت اگر یہ کام نہیں کرتی تو اس کی ضرورت کا احساس رکھنے والے دین دار لوگ پرائیویٹ سیکٹر میں یہ کام کرسکتے ہیں...... کچھ کام ہوا بھی ہے۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ سچی باتیں تلخ انداز میں قلم سے نکل گئیں کہ آج درد کچھ دل میں سوا ہوتا ہے۔ تاہم، ہم انسان ہیں، نہ معصوم ہیں اور نہ عقل کل۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے دلیل سے کہا ہے۔ اگر کوئی

صاحب ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف اپنی مدلّل رائے سامنے لانا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی ☆

نسل نو پر مغربی تعلیم کے اثرات

انگلش میڈیم سکولوں کے نصابات کا ایک جائزہ (آخری قسط)

'Essential Fiction'

انگریزی ادب کے نام پر کیا پڑھایا جارہا ہے؟

Adexcle سسٹم کے تحت تیسری جماعت کے بچوں کو Brian Moses کی مرتبہ Essential Fiction پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب کی پشت [back] پر اس عظیم شاہکار کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے This Essential fiction anthology has been carefully put to gether to give you some of the very best examples of children's literature اگر مغرب میں سب سے بہترین ادب اس کا نام ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بدترین ادب کس درجے کا ہوگا آیئے اس بہترین شاہکار انتخاب کا جائزہ لیتے ہیں: کتاب میں ایک کہانی ہے Rumpelstilskin اسے روایتی کہانی [Traditional Story] بتایا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک غریب چکی والے سے ہوتا ہے جو شیخ چلی کی طرح اپنی خوبصورت بیٹی کے بارے میں اونچی اونچی باتیں ہانکنے کا شوق رکھتا تھا چکی والا ایک دن بادشاہ کے دربار میں گیا اس نے کہا کہ میری بیٹی بہت دانا، زیرک اور ہشیار ہے وہ بھوسے کو سونے میں تبدیل کرسکتی ہے یعنی لڑکی کا باپ صرف شیخی خور ہی نہیں جھوٹا بھی تھا اور احمق بھی بادشاہ جو سونے کا دیوانہ تھا بہت خوش ہوا اور اس سے کہا کہ چلو ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری بیٹی کیا واقعی بھوسے کو سونے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتی ہے اچانک چکی والے کو اپنے احمقانہ جھوٹی باتوں کا احساس ہوا اس نے بادشاہ کے حضور معافی پیش کی لیکن وقت گزر چکا تھا بادشاہ نے چکی والے کی لڑکی کو پکڑ کر ایک ایسے کمرے میں بند کردیا جہاں بھوسہ بھرا ہوا تھا بادشاہ نے لڑکی سے کہا اب میں تمہاری ذہانت دیکھوں گا اس کمرے میں موجود تمام بھوسے کو صبح سے پہلے پہلے سونے میں تبدیل کردینا ورنہ میں تمہارے سر کو پاش پاش کردوں گا بادشاہ یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا تنہا لڑکی رونے لگی وہ بھوسے کو سونے میں نہیں بدل سکتی تھی

☆ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

اسے اپنی موت سر پر منڈلاتے ہوئے نظر آ رہی تھی اچانک دروازہ زور سے کھلا اور ایک چھوٹا سا اجنبی شخص نمودار ہوا اس نے لڑکی سے پوچھا تم کیوں رو رہی ہو؟ ماجرا سن کر اجنبی نے کہا اچھا اگر میں اس بھوسے کو سونے میں بدل دوں تو تم مجھے اس کے بدلے میں کیا دو گی؟ لڑکی نے کہا میں اس کے بدلے میں اپنا ہار تمہیں دے دوں گی چھوٹے سے شخص نے اپنا کام شروع کیا صبح سے پہلے پہلے بھوسہ سونے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اتنا سارا سونا دیکھا تو بہت خوش ہوا مگر اس کا لالچ مزید بڑھ گیا اس نے غریب لڑکی کو پہلے سے بڑا کمرہ دیا جو پہلے سے زیادہ بھوسے سے بھرا ہوا تھا اور حکم دیا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے یہ بھوسہ سونے میں بدل دو ورنہ تمہارا سر پاش پاش کر دوں گا، جیسے ہی بادشاہ کمرے سے باہر نکلا لڑکی رونے لگی چھوٹا شخص اچانک دوبارہ نمودار ہوا ماجرا سنا اور پوچھا چلو میں بھوسہ سونے میں بدل دوں گا مگر تم اس کے معاوضے میں تم مجھے کیا دو گی لڑکی نے کہا میں اپنی انگوٹھی تمہیں دے دوں گی، چھوٹے آدمی نے بھوسے کو سونے میں بدلنے کا کام شروع کر دیا (۱) کہانی کا پہلا سبق یہ ہے کہ باپ احمق لالچی بے وقوف جھوٹا ہے اور اتنا بے وقوف کہ اپنی بیٹی کو بادشاہ کے ہاتھوں پھنسوا دیا اس کی جان کے لالے پڑ گئے (۲) بادشاہ اتنا لالچی اور احمق کہ بھوسے کو سونے میں بدلنے کا کام ایک ایسی لڑکی کے سپرد کر دیا جس کے باپ نے اپنے احمقانہ الفاظ واپس لے کر اس سے معذرت کر لی تھی مگر اس نے سوچا کہ کیا پتہ اسے یہ ہنر آتا ہو آزمانے میں کیا ہرج ہے؟ (۳) بادشاہ اتنا ظالم کہ باپ کی غلطی کی سزا ایک معصوم لڑکی کو دینے پر آمادہ ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم نے بھوسے کو سونے میں نہیں بدلا تو سر کچل دوں گا حالانکہ روایتی تہذیبوں میں بادشاہ رعایا کا باپ تصور کیا جاتا تھا اور عورتوں کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا برنارڈ لیوس نے اپنی کتاب What went wrong میں 1860 میں آسٹریا کے صدر مقام ویانا کا واقعہ ایک ترک سفیر کی زبانی نقل کیا ہے کہ وقت کا بادشاہ ویانا کی سڑک پر گھڑ سواری کر رہا تھا اس نے ایک عورت کو آتے ہوئے دیکھا تو گھوڑے کی باگ کھینچ لی گھوڑا روک کر اترا اور اس عورت کے احترام میں کھڑا ہو گیا دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے کہ بادشاہ چہل قدمی کر رہا تھا اچانک ایک عورت سامنے سے گزری تو وہ اس کے احترام میں رک گیا اپنی ٹوپی سر سے اتار کر نیچے جھکا یہ عورت کا احترام تھا جس مغربی تہذیب کا بادشاہ اٹھارہویں صدی میں عورت کا اتنا احترام کرتا تھا اس تہذیب میں بادشاہ کو اتنا سفاک بتانا درست بات نہیں ہے (۴) ایک مظلوم لڑکی کی مدد

کرنے والا اجنبی چھوٹا شخص بھی لالچی ہے وہ لڑکی کی مدد رحم، ہمدردی، انسانیت کے جذبے کے تحت نہیں کرر ہا بلکہ اس سے مدد کا معاوضہ طلب کرر ہا ہے یہ کس قسم کی تہذیب ہے اور کیسا آدمی ہے؟

(۵) بادشاہ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر لڑکی بھوسے کو سونے کے ڈھیر میں بدل سکتی ہے تو اس کے ابو چکی کیوں چلاتے ہیں وہ تو بھوسے کو سونے میں بدل کر دولت مند بن سکتے ہیں کسی سلطنت کو سنبھالنے والا بادشاہ تو ذہین ہوتا ہے لڑکی نے پہلی بار جب بادشاہ کو سونے کا ڈھیر بنا کر دیا تو بادشاہ خوش ہوا لڑکی نے اس وقت سچ بول کر اپنی جان کیوں نہیں بچائی وہ بادشاہ کو سچ سچ بتادیتی کہ یہ سونا کس نے بنایا ہے مگر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرر ہی تھی؟ جبکہ تیسری بار بھوسے کو سونا بنانے کے بعد بادشاہ نے شادی کی پیشکش کی تھی اسے لڑکی کی نہیں بلکہ سونے کی لالچ تھی وہ سونے کی کان سے شادی کرر ہا تھا انسان سے نہیں، شادی سے پہلے بادشاہ نے اور لڑکی کے باپ نے کوئی مشورہ نہیں کیا نہ لڑکی نے بادشاہ سے کہا کہ میں اپنے ماں باپ سے پوچھ لوں حریص حاسد لڑکی کو محل کی زندگی فریب دے رہی تھی لڑکی یہ بھی جانتی تھی کہ اجنبی چھوٹا آدمی بھی لالچی ہے اگر وہ بادشاہ کے سامنے نمودار ہوتا تو بادشاہ کو بھی سونا ملتا رہتا اور اجنبی چھوٹا آدمی بھی جو چاہتا بادشاہ سے بدلے میں لیتا اس طرح دونوں لالچی اپنے مقاصد حاصل کر لیتے کہانی میں کسی ایک کردار کو سچا اور ایماندار بتایا جاسکتا تھا تاکہ بچے سچائی اور ایمانداری سیکھتے انھوں نے اس کہانی سے یہ سیکھا کہ ملکہ نے جھوٹ بول کر مسئلے کا حل نکالا اور کامیاب رہی۔ کہانی میں یہ پیغام بھی تو دیا جاسکتا تھا کہ اگر سچ بول کر بھی بادشاہ لڑکی کی جان لیتا تو سچائی کی خاطر وہ لڑکی جان کی قربانی دے دیتی اس طرح لڑکی کے باپ کو بھی لالچ اور جھوٹ بولنے کی سزا مل جاتی

(۶) مدد کرنے والا اجنبی شخص لڑکی کے باپ کی طرح نہایت احمق بھی ہے اس کے پاس یہ فن موجود ہے کہ وہ ایک کمرہ بھر بھوسے کو سونے میں تبدیل کر لے تو وہ یہ کام کرنے کے بجائے لڑکی سے سونے کا ہار اور انگوٹھی مانگ رہا ہے اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ نہایت لالچی ہے کیونکہ اسے بھوسے کو سونا بنانا تو آتا ہے لیکن اگر کہیں سے کچھ اور سونا مل جائے تو اس کو ہتھیانے میں کیا ہرج ہے کسی مظلوم کی بلا معاوضہ مدد کرنا اچھی بات نہیں ہر کام کا معاوضہ لینا چاہیے مغرب میں لبرل ازم اور انسانی حقوق کے تحت فلسفہ یہی ہے کہ کام work ہر شخص کو کرنا چاہیے کہ کام سے سرمایہ ملتا ہے اور سرمایہ سے آزادی ملتی ہے جس کے پاس زیادہ سرمایہ ہے وہ زیادہ آزاد ہے لہٰذا آزادی کی ٹھوس شکل مغرب میں سرمایہ ہی ہے جو کام نہیں کرتا سرمایہ نہیں کماتا وہ آزاد نہیں ہے عقل مند نہیں ہے احمق ہے

نفسیاتی مریض ہے اس لیے فوکالٹ لکھتا ہے کہ کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے The absence of work is madeness لہٰذا مغرب میں ہر شخص کام کرتا ہے تا کہ سرمایہ کما سکے جو عورت گھر میں رہ کر گھر کے کام کرتی ہے اس کو مغرب کام نہیں تسلیم کرتا کہ اس کام سے سرمایہ نہیں ملتا اسے مغرب working women نہیں کہتا لیکن جس لمحے یہ عورت گھر میں بچوں کے کپڑے دھونے، باورچی خانہ میں کھانا پکانے کے بجائے یہی کام لانڈری اور ہوٹل میں دوسروں کے لیے انجام دے جس کے اسے پیسے ملیں تو اس عورت کو فوراً working women کہا جاتا ہے رنڈی کو مغرب میں قابل عزت سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے جسم سے کام لے کر سرمایہ کماتی ہے لہٰذا مغرب میں اس کا عزت والا نام ہے sex worker کیونکہ مغرب کے بہت بڑے فلسفی جان لاک نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ انسان کا جسم اس کی ملکیت ہے اور وہ اس میں آزادانہ طور پر تصرف کا اختیار رکھتا ہے یعنی جسم اللہ کی ملکیت اور ہمارے لیے امانت نہیں انسان کی ملکیت ہے لیکن ظاہر ہے روایتی تہذیبوں میں ایسا نہیں ہوسکتا

کہانی آگے چلتی ہے، چھوٹا آدمی صبح سے پہلے بھوسے کو سونا بنا کر غائب ہو جاتا ہے جب بادشاہ دیکھتا ہے کہ لڑکی نے اتنے سارے بھوسے کو سونا بنا دیا ہے تو اس کا لالچ اور بڑھ جاتا ہے اسے مزید سونا چاہیے لہٰذا وہ اس رات لڑکی کو ایک بہت بڑے کمرے میں منتقل کرتا ہے جو بھوسے سے بھرا ہوتا ہے اور وہی حکم دیتا ہے کہ صبح تک اسے سونا بنا دو اگر تم نے ایسا کر دیا تو میں تم سے شادی کر کے تمہیں اپنی ملکہ بنا لوں گا جیسے ہی بادشاہ کمرے سے باہر نکلتا ہے لڑکی رونے چلانے لگتی ہے ایک تو خطرہ کہ سونا نہ بنایا تو قتل کر دے گا دوسرے امید کہ سونا اگر بنا دیا تو شادی ہو جائے گی اتنا بڑا محل مل جائے گا خوف اور لالچ کے جذبات اس پر غالب تھے۔ کچھ کھونے کا غم اور کچھ پانے کی امید اچانک اجنبی چھوٹا شخص دوبارہ نمودار ہوتا ہے مدد کا وعدہ کرتا ہے لیکن پوچھتا ہے کہ اس مدد کے صلے میں وہ کیا معاوضہ دے گی لڑکی صدمے سے کہتی ہے کہ اب تو میرے پاس دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے This time I have no gift to give you (مغرب میں جو چیز مانگ کر لی جاتی ہے اسے تحفہ gift کہتے ہیں کہانی میں یہی فلسفہ پیش کیا گیا ہے) اجنبی آدمی لڑکی سے وعدہ لیتا ہے کہ اچھا جب تمہارا پہلا بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ مجھے دے دینا وہ وعدہ کر لیتی ہے اجنبی آدمی مستقبل کے وعدے پر بھوسے کو سونا بنا دیتا ہے لڑکی کی جان بھی بچاتا ہے اس کا مستقبل بھی شاندار کر دیتا ہے بادشاہ اس لڑکی سے شادی کر کے ملکہ بنا لیتا ہے ملکہ کے یہاں بچہ پیدا ہو جاتا ہے ملکہ اپنے لڑکے کے ساتھ ایک دن بیٹھی ہوتی ہے اچانک دروازہ کھلتا ہے چھوٹا آدمی آتا

ہے اور اسے بھولا ہوا وعدہ یاد دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لڑکا میرے حوالے کردو ملکہ رونے لگتی ہے اس سے بچے کی بھیک مانگتی ہے کہ اسے تم لے کر نہ جاؤ چھوٹا آدمی اسے تین دن کا وقت دیتا ہے کہ اگر تم تین دن کے اندر میرا درست نام بتادو تو میں بچہ تم سے نہیں لوں گا تم اسے اپنے پاس رکھ لینا ملکہ ساری رات جاگتی ہے اور اس کا نام سوچنے کی کوشش کرتی ہے اگلے دن جب وہ شخص آتا ہے تو وہ اندازے سے مختلف نام بتاتی ہے وہ جواب دیتا ہے تم نے میرا صحیح نام نہیں بتایا وہ کمرے میں خوشی سے ناچنے لگتا ہے اسے امید ہے کہ اب اس کی محنت کا صلہ اس بچے کی صورت میں ملے گا اگلے دن ملکہ کا باپ اس سے ملنے آتا ہے ملکہ اس سے مدد کی بھیک مانگتی ہے دوسرے دن چھوٹا آدمی دوبارہ آتا ہے دوبارہ ملکہ سے اپنا نام پوچھتا ہے ملکہ غلط نام بتاتی ہے وہ کہتا ہے کہ نہیں تم صحیح نام نہیں بتاسکتیں اب یہ بچہ میرے حوالے کردو وہ ایک دن کی مزید مہلت دے کر چلا جاتا ہے۔ ملکہ کا باپ ایک فیصلہ کرتا ہے وہ اجنبی شخص کے جاتے ہی اس کی تلاش شروع کرتا ہے جنگل کے ایک کونے میں اسے بہت چھوٹا سا گھر نظر آتا ہے وہ گھر میں جھانکتا ہے اسے اندر سے ناچنے گانے کی آوازیں آتی ہیں گھر میں وہی آدمی نظر آتا ہے اندر سے آنے والی آوازوں میں اس آدمی کا نام بھی وہ سن لیتا ہے کیونکہ وہ گا رہا ہے For Rumpl stiltskin is my name ملکہ کا باپ یہ نام سن کر دوڑتا بھاگتا محل میں واپس آتا ہے اپنی بیٹی کو نام بتاتا ہے اگلے دن جیسے ہی وہ چھوٹا آدمی بچے کو لینے سے پہلے اپنا نام پوچھتا ہے تو ملکہ جھوٹ موٹ دو تین غلط نام بتاتی ہے اچھا تمہارا نام Herbert ہے وہ کہتا ہے نہیں اچھا تو Humphrey ہے وہ کہتا ہے نہیں اور تم اب کبھی میرا نام نہیں بتاسکو گی لہٰذا بچہ میرے حوالے کردو ملکہ تو اسے بے وقوف بنا رہی تھی پھر وہ اچانک کہتی ہے Could it be possibly be Rumpel Stiltskin یہ نام سنتے ہی چھوٹا آدمی غصے سے آگ بگولہ ہوجاتا ہے تمہیں میرے نام کا پتہ کیسے چلا وہ چیختا چنگھاڑتا زمین پر نہایت زور سے اپنے پاؤں مارتا ہے اس کے پیر زمین میں دھنس جاتے ہیں وہ غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے وہ پیر زمین سے کھینچ کر نکالتا ہے اور خود دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے کہانی میں آپ نے دیکھا کہ باپ لالچی شیخی خورا جھوٹا بادشاہ لالچی ظالم شر پسند حریص حاسد بدمعاش مظلوم لڑکی کی مدد کرنے والا بھی لالچی کہ مدد کا معاوضہ طے کرتا ہے پھر مدد کرتا ہے لڑکی بھی لالچی کہ اس ظالم بدمعاش بادشاہ سے خوشی خوشی شادی کررہی ہے جو اس کی جان کا دشمن تھا اور ایک ایسا کام اس کے سپرد کررہا تھا جو وہ نہیں کرسکتی تھی اور قتل کی دھمکی دے رہا تھا مگر وہ ایسے ظالم بے غیرت بادشاہ کی ملکہ بننے کے لیے تیار ہوگئی

تاکہ اپنے کنگلے باپ کی جھونپڑی کے بجائے عالی شان محل میں خوش رہ سکے لڑکی جھوٹی دھوکے باز اپنے محسن سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے پر تیار نہیں ہوئی اس کے محسن نے اس کی جان بچائی اس کی وجہ سے لڑکی کو بادشاہ کا رشتہ ملا مگر محسن کُشی ضروری تھی اس کا باپ بھی جھوٹا لالچی دھوکے باز اتنی سخت مشکلات دیکھنے کے باوجود بھی اس کی اخلاقی حس بیدار نہ ہوئی اس نے جاسوسی کی اور اپنی بیٹی کی غیر اخلاقی حمایت کی اس نے بیٹی سے یہ نہیں کہا کہ پہلے میں نے جھوٹ بولا تو اتنی آزمائش آئی اب ہم سچ بولیں گے تم اپنا وعدہ پورا کرو جس میں عہد کا پاس نہیں وہ انسان کسی عزت کے قابل نہیں

اس کہانی کے تمام کردار ہی خبیث، گھٹیا، اور اخلاقی اقدار سے عاری ہیں ایسی کہانی کو بچوں کے نصاب میں شامل کر کے ان کو کیا سکھایا جا رہا ہے؟

☆ اسی کتاب کا پہلا سبق ہے The Twelfth floor kids اس میں بتایا گیا ہے کہ اصل زندگی تو فلیٹ کی زندگی ہوتی ہے بارہویں منزل پر ایک فلیٹ میں چھ لوگ رہتے ہیں امی ابا چار بچے اس میں دانستہ طور پر دادا دادی نانا نانی کو شامل نہیں کیا گیا یہ خاندان کا حصہ نہیں ہوتے کیونکہ مغرب میں ان کو old home میں پھینک دیا جاتا ہے فلیٹ میں Amy کا الگ کمرہ دکھایا گیا ہے یعنی ہر بچے کا کمرہ الگ الگ ہونا چاہیے دوسری تصویر Eddie کی ہے وہ بتاتی ہے کہ میں باپ کے بغیر اس فلیٹ میں اپنی بہن اور ماں کے ساتھ رہتی ہوں ماں کی دکان ہے وہ دکان پر کام کرتی ہے یہاں پیغام بالکل واضح ہے تیسری تصویر seeta کی ہے اس کے گھر میں بھی خالہ پھوپھی چچی نانی دادی دادا کوئی بوڑھا آدمی نہیں ہے کیونکہ مغرب میں ان سب کا ٹھکانہ اولڈ ہوم ہے آخری تصویر Dan کی ہے جو اپنی امی اور بلی Jinny کے ساتھ رہتا ہے گھر میں بوڑھوں کے لیے جگہ نہیں ہے کتوں بلیوں کے لیے جگہ ہے ان کو گود میں بٹھایا لٹایا جاتا ہے اپنے بستر پر سلایا جاتا ہے اور بوڑھی نانی دادا کو اولڈ ہوم میں یہی تہذیب بتائی گئی ہے Jinny کا باپ اس کے ساتھ نہیں رہتا اس کا باپ سڑک اور علاقے کے اُس پار دوسری جگہ رہتا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ کبھی کبھی اس کے پاس جاتا ہے۔

My dad lives over the other side of town & some times I go to see him at the weekend.

پاکستانی اسلامی خاندانی نظام میں آنکھ کھولنے والے بچوں کو پیغام دیا گیا ہے کہ خاندان یہ ہوتے ہیں ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے اور پتنگوں کی طرح منتشر خاندان بغیر

باپ کے بغیر بزرگوں کے اور وہاں عورتیں دکانوں پر بیٹھ کر کام کرتی ہیں کیونکہ مطلقہ، بیوہ یا معذور شوہر کی عورت کی کفالت کی ذمہ داری مغرب میں نہ باپ اٹھاتا ہے نہ بھائی نہ خاندان کے لوگ نہ قبیلہ نہ محلے والے ہر شخص اپنی لاش خود ہی اٹھا کر گھومتا ہے کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں بچے اسکول میں پڑھتے ہیں تو نوکری شروع کردیتے ہیں پاکستان کے بچوں کی طرح ماں باپ کے سرمایے سے مزے نہیں کرتے اعلیٰ تعلیم کے لیے ہر بچے کو قرضہ ملتا ہے یہ قرضہ وہ خود ادا کرتے ہیں یہی آئیڈیل زندگی ہے مغرب کو پاکستان اور دنیا بھر میں یہی طرز زندگی مطلوب ہے یہ سازش نہیں ہے وہ اسی طرز کو الحق سمجھتے ہیں یہ الحق رینے ساں اور روشن خیالی کی تحریک [Enlightenment Movment] کے دو اہم ترین دھاروں جدیدیت [Modrenism] اور رومانویت [Romanstism] سے نکلتے ہیں جدیدیت عقلیت سائنس وٹکنالوجی کے ذریعے اور رومانویت وجدان ادب شاعری قصے کہانی آرٹ کے ذریعے روشن خیالی کو عام کرتی ہے یہ کہانیاں رومانوی تحریک کے زیر اثر تخلیق ہورہی ہیں تاکہ قدیم روایتی معاشروں کو جدید آزاد روشن خیال معاشروں میں تبدیل کیا جاسکے

☆ دوسرا سبق ہے It is not fair اس میں بتایا گیا ہے کہ کھانے کی چیزوں کا احترام نہ کریں کھانے کی چیزوں کو کھیلنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے روایتی، مذہبی اسلامی تہذیبوں میں کھانے کی چیز کا بہت احترام ہوتا ہے کہ یہ رزق ہے جو اللہ نے دیا ہے یہ امانت ہے جسے رزق ملا ہے وہ شکر ادا کرے اور شکر ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زبانی شکر کے کلمات کہنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے رزق اور اس کی نعمتوں میں ان کو شریک کرے جو اس سے محروم ہیں لہٰذا ہمارے یہاں روٹی زمین پر گر جائے تو اسے اٹھا کر چومتے ہیں صاف کرکے کھا لیتے ہیں اگر کھانے کے قابل نہ ہو تو پرندوں کو ڈال دیتے ہیں لیکن یہاں بچے کو سبق دیا جارہا ہے کہ انڈہ چمچے میں ڈال کر دوڑ لگاؤ خواہ دوڑتے ہوئے انڈہ گرجائے پھٹ جائے زمین اور کپڑے گندے کردے کیونکہ مزہ تو آرہا ہے Once come first in the egg & spoon race. Kitty کا قد چھوٹا ہے اس کی جماعت میں ایک لمبا لڑکا ہے جو اسے چھوٹے قد کے باعث جھینگا [Shrimp] کہتا ہے یہ تہذیب ہے بچوں کا کام ہے قد آدم تصویریں [Mural] بنانا ٹام اس پر ہنس رہا ہے کہ وہ میورل پر آسمان نہیں بناسکتی کہ گڈی چھوٹی ہے کسی بچے نے شرارت سے اس کی جیکٹ اٹھا کر بہت اونچی جگہ پر لٹکا دی ہے وہ شرم کے

مارے کسی سے جیکٹ اتارنے کا نہیں کہتی وہ باہر جاتی ہے تو اسے سخت سردی لگتی ہے ایک بدتمیز لڑکی kitty کا مذاق اڑاتی ہے کوئی تمھیں اپنی ٹیم میں نہیں لے گا تم بہت چھٹنکی ہو Your are too tiny

وہ گھر پہنچی تو بہت اداس تھی ماں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا اس کے بھائی نے اسے بتایا کہ مجھے بھی اسکول میں بچے shorty کہتے تھے مگران کا رویہ بہت محبت آمیز دوستانہ ہوتا تھا میں برا نہیں مانتا تھا ہماری کلاس میں جولڑکا لمبا اور پتلا تھا اسے ہم stringy کہہ کر پکارتے تھے لہٰذا نام رکھنے اور چڑانے سے کچھ نہیں ہوتا اگلے دن بچی اسکول گئی اس نے دیکھا کہ اس کے دوست Tom کے بال نارنجی بھورے تھے اور اسے اپنے بالوں سے نفرت تھی اس نے بتایا کہ اسے اسکول میں بچے Carrots کہتے تھے اس کے بعد Kitty نے میدان میں اسکول کے بچوں کو اپنے اِردگرد دیکھا کوئی لمبا، کوئی موٹا، کوئی پتلا، کالا، سانولا، شرمیلا، کوئی بہادر، کوئی گا سکتا تھا، کوئی تیر سکتا تھا، کوئی نازک، نفیس، لطیف، کوئی بھدّا، بے ڈھب اس نے فیصلہ کیا کہ ہم سب مختلف ہیں لہٰذا جو لوگ مجھے Shrimph کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں We are all different and I suppose that's fair سبق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برے گندے غلط ناپسندیدہ ناموں سے پکارنا بری بات نہیں ہے ایک دوسرے کے برے برے نام رکھنا، چڑ بنانا، چڑانا بہت اچھی بات ہے یہ تو حقیقت ہے حقیقت کا بہادری سے سامنا کرنا چاہیے رونے پیٹنے چیخنے کی ضرورت نہیں کیا تہذیب سکھائی گئی ہے؟

☆ ایک سبق ہے The tasting game تصویر میں عالیشان باورچی خانہ ہے ٹائلز لگے ہوئے ہیں اوپر سے نیچے تک الماریاں ہی الماریاں ہیں ایک فریج رکھا ہے جو انواع واقسام کی اشیاء سے اٹا پڑا ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر چیزوں کو چکھ کر پہچاننے کا کھیل ہو رہا ہے چیزوں کے نام سنیے اسٹرابری جام، Cranberry Jelly، Peanut butter، Raisins، , Syrup Cheese, sugar , vinegar, ice cream, mustard , orange squash , banana Milk shake ایک ایسے ملک میں جہاں پچاس فی صد آبادی پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھا سکتی چھ ہزار آدمی ہر سال بھوک سے خودکشی کر رہے ہیں وہاں سات سال کے بچے کو یہ آئیڈیل زندگی پڑھائی سکھائی جا رہی ہے ایک گھر میں کھانے پینے کی اتنی چیزیں اور لاکھوں گھروں میں دو وقت کی روٹی نہیں ہے کھیل میں کیا سکھایا جا رہا ہے سنیے: Then 1 pinched

Ben's nose & shoved the spoon into his mouth اسی کتاب میں Baira & Vutures who owned fire کی کہانی تہذیب کی کہانی ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ مرد عورت تہذیب کے آغاز میں ننگے رہتے تھے صرف ایک چھوٹا سا کپڑا شرم گاہ پر لٹکا لیتے ہیں معلوم نہیں یہ کپڑا ابھی کہاں سے مل گیا ورنہ جدید مغرب تو کپڑے اتارنے کو فطرت کا تقاضہ سمجھتا ہے اس سے آزادی میں اضافہ ہوتا ہے انسان کچا کھانا کھاتے تھے ان کے پاس آگ نہیں تھی قرآن بتاتا ہے کہ ہم نے ایسے درخت پیدا کیے ہیں جن کو رگڑ کر تم ان سے آگ حاصل کرتے ہو وہ درخت کہانی لکھنے والے کو نظر نہیں آئے سبق بتاتا ہے کہ لوگ کچی چیزیں دھوپ میں خشک کرکے کھاتے تھے ان کو آگ کی تلاش تھی گِدھوں کے پاس آگ ہوتی تھی لہٰذا ایک بہادر شخص نے فیصلہ کیا کہ وہ گدھوں سے آگ چھین لے گا جس طرح اس زمین پانی چمکتے سورج کا کوئی مالک نہیں ہے آگ بھی کسی کی ملکیت میں نہیں ہونی چاہیے یہاں بین السطور میں اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے کا انکار موجود ہے the earth, the water, & the sunshine had no owner then fire should be for every one too اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اس کائنات کی ہر چیز اور خود انسان بھی اللہ نے یہ کائنات تمام انسانوں کے لیے پیدا کی ہے اسی لیے اسلام میں چراگاہ، پانی، نمک، پر کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی آخر کار بہادر آدمی نے گِدھوں سے آگ چھین لی اس خوشی میں رات کو ایک دعوت ہوئی جس میں سب کچھ جائز تھا there was a party that night all right ایک ہفتے تک گانوں اور رقص سے آگ کے حصول کی خوشی کا جشن منایا گیا a whole week with songs and dances تصویر میں بتایا گیا ہے اس رات جو جشن منایا گیا اس میں تمام مرد عورتیں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ناچ رہے تھے کسی شرم، حیاء، کی ضرورت نہیں ہے سب مرد عورت برابر ہیں جو جس کا ہاتھ پکڑے اور پکڑنے والے کو اعتراض نہ ہو تو یہ ٹھیک ہے خوشی کے اظہار کا کتنا صحیح اسلامی طریقہ بچوں کو بتایا گیا ہے!

☆ اسی کتاب میں The Toad Tunnel، ایک سبق ہے Tods کے لیے سرنگ کی صفائی میں کتنی جان لگائی گئی اس کا اندازہ اس کہانی سے ہوتا ہے انسانوں کی بھلائی، بہتری کے لیے کوئی کہانی اس کتاب میں نہیں ہے جانوروں اور جانداروں سے تعلق اور محبت سکھائی جارہی

ہے ایک نسل جو اپنی دادی دادا کو گھر میں رکھنے پر تیار نہیں جانوروں پرندوں حشرات الارض کے لیے اتنی فکر مند اتنی پریشان کیوں ہے؟ انسان غیر اہم ڈڈو، مینڈک، آگ، کھانا پینا سب اہم ہے۔

☆ At the End of School Assembly اس سبق میں زبان و بیان سکھانے کے نام پر بدنظمی، کھیل تماشے کو معیار کے طور پر پیش کیا گیا ہے، ہلہ گلہ، شور شرابہ، غیر سنجیدگی یہی مغربی تہذیب کا حاصل ہے۔ الحمد اللہ ہمارے تمام انگریزی اسکولوں میں اور وہ اسکول جہاں اسلامی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے عموماً یہی صورت حال ہوتی ہے چھٹی ہوتے ہی بچے پاگل ہوجاتے ہیں ظاہر ہے جدیدیت نے اسکول کے نام پر جو جدید قید خانہ تعمیر کیا ہے اس سے آزادی حاصل ہونے پر بچے خوش نہ ہوں تو کیا کریں مگر ماں باپ بہت خوشی سے اپنے ڈیڑھ سال کے بچے کو اس قید خانے میں پیسے دے کر داخل کراتے ہیں یہ بھی تاریخ انسانی کا لطیفہ ہے کہ خدا کے لیے ہم سے پیسے لے لو مگر اس شیطان کو اپنی قید میں رکھو ورنہ ہم اپنے گھر میں اس کے قیدی بن جائیں گے صرف ترقی معاشی و مادی فلاح Progress اور Development کے لیے ماں باپ بچے کو اس قید با مشقت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں ماریہ سبرٹ نے The Deveopment Dictionary : A guide to knowledge as power میں Progress پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے ہم بار بار اپنے مضامین میں اسلامی تحریکوں اور اسلامی ذہن رکھنے والوں کو توجہ دلاتے ہیں کہ اس لغت کا لازمی مطالعہ کریں اس صدی کے بہت سے مفروضات، عقیدوں، نعروں، دعووں اور واہموں کی حقیقت کھولنے کے لیے یہ کتاب کافی ہے اسکولوں کے منتظمین اس کے ابواب Development اور Poverty کا لازماً مطالعہ کریں ہائیڈیگر کا آخری انٹرویو جو جرمنی کے رسالے "Speiegel" کو دیا گیا جس میں ہائیڈیگر نے وہ تاریخی جملہ بھی کہا تھا Only God can save this world وہ انٹرویو بھی اسکولوں کے منتظمین کے لیے جدید انسان کے ذہنی، عقلی، حالت منکشف کرتا ہے جدید تعلیم اور جدید جبر انسان کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے سوچنے پر مجبور کرتا ہے وہ ہے تسخیر کائنات اور کائنات کا استحصال

Ivan ilich کی کتاب D-schooling Society اسکول کے جدید قید خانوں کے بارے میں کچھ نئی باتیں بتاتی ہے امریکہ میں Dad School اور Mom School بھی کچھ نئی باتیں سناتے ہیں۔ ہماری تاریخ میں تعلیم و تدریس کا نظام کیا تھا اس کے لیے ڈاکٹر فضل الرحمان کی کتاب Islam & Modrenity کا مطالعہ کیجیے آپ حیران رہ جائیں گے مدارس دینیہ کا موجودہ اقامتی

اور ادارتی نظام بھی اسلامی تاریخ میں اس شکل میں کبھی نہ رہا جو گزشتہ ایک صدی میں حالات کے تقاضوں کے تحت وجود پذیر ہوا ہے اس موضوع کو سید سلیمان ندوی نے ’’حیات شبلی‘‘ میں تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے اس کا مطالعہ ضروری ہے ادارتی اقامتی نظام کے جہاں فوائد ہیں وہیں بے شمار مسائل بھی ہیں جن پر گہرے تدبر کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم یہ تھا کہ ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے تین ہم سبق حضرت مجدد الف ثانیؒ، عالم اور بزرگ بنے، سعد اللہ خان بادشاہ وقت کا وزیر اعظم بنا اور احمد معمار لاہوری نے تاج محل بنایا ۱۸۸۶ء میں انگریزوں نے رڑکی میں پہلا انجینئرنگ کالج بنایا لیکن اس کالج کے بننے سے پہلے تاج محل، بادشاہی مسجد، شالامار باغ اور ہندوستان بھر میں تعمیرات کے اعلیٰ ترین شاہکار تخلیق کرنے والے کسی انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل نہیں تھے ہڑپہ، موہنجوداڑو، بابل، نینوا، روم، ایران، یونان، چین میں آخر فنون کہاں سے سیکھتے تھے؟ اہرام مصر بنانے والے فن کاروں نے کسی انجینئرنگ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی ان سوالات اور نکات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم تعمیراتی دنیا کے شاہکار تخلیق کرنے والے اذہان کی تعمیر، تشکیل، تربیت، تدریس کے نظام سے واقفیت حاصل کرسکیں ہمارا مقصد صرف غور و فکر کے نئے دریچے کھولنا ہے نہ کہ حاضر و موجود نظام کو حرام یا کفر قرار دے کر یکسر مسترد کردینا ہم ایک خاص تاریخ، زمان و مکان میں پیدا ہوئے ہیں جو کچھ حاضر ہے اسے گہری نظر سے جاننا اور جانچنا ہے اگر تنقیدی شعور بیدار رہے تو متبادل نظام کا خاکہ بھی تخلیق ہوسکتا ہے اور حاضر و موجود میں اصلاح، تصحیح و ترمیم کے امکانات بھی روشن ہوتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے حاضر و موجود کی بڑے پیمانے پر اصلاح اور متبادل کی جستجو اس کے لیے گفتگو، مباحثہ غور و فکر کا دروازہ کسی کی نیت و اخلاص پر شک و شبہ کیے بغیر ہمیشہ کھلا رکھا جائے۔

مال و دولت کمانے اور جمع کرنے میں لوگ یہ بھول جاتے ہیں
کہ کفن میں جیب نہیں ہوتی

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

مخلوط تعلیم

مضمرات، خطرات اور نقصانات

مخلوط تعلیم کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں بلکہ یہ شعبہ تعلیم میں مغربی استعماری اثرات کی پیداوار بہت سے مسائل میں سے ایک ہے۔ تعلیم ایک سماجی عمل ہے اور سماجی اقدار تعلیم کے نظریے اور تعلیمی عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن ہم ذہناً اور عملاً سیکولر اقدار، سیکولر نظریات اور سیکولر افعال پر عمل پیرا ہیں اور اس میں کوئی استثنیٰ نہیں۔ دفتر کا مسٹر ہو یا مسجد کے مولوی صاحب، زبان سے کچھ بھی کہیں عملاً سب سیکولر ہیں یعنی اُن کا دین کا خانہ الگ ہے اور دنیا کا خانہ الگ۔

حکومت جو اجتماعیت کا مظہر ہوتی ہے وہ دین کی مداخلت پسند نہیں کرتی اور اہل مسجد و مدرسہ جو دین اسلام کی نمائندگی اور اظہار کا دعویٰ کرتے ہیں وہ حکومت کی مداخلت کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یہ جو کچھ کہا گیا، نتیجہ ہے مغربی استعمار کے اَن منٹ اثرات کا جو ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ اور دیگر مغربی ماہرین نفسیات انسان کی زندگی کے تقریباً تین چوتھائی اعمال اور فیصلوں کو اس کے لاشعور اور تحت الشعور کا کارنامہ سمجھتے ہیں جب کہ اسلام انسانی زندگی کے تمام کاموں کو شعوری اور ارادی عمل سے وابستہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح تصورِ انسان اور تصورِ حیات کا بنیادی فرق تعلیم کے ہر ہر شعبہ میں نمایاں ہوجاتا ہے۔ پاکستانی فیصلہ سازوں کا اصل مسئلہ ان کی وہ فکری اور ذہنی مرعوبیت ہے جس کی بنا پر وہ لادینی مغربی تصورِ علم اور تصور تعلیم کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ وہ ان کے فکری سانچوں سے نکلنا بھی چاہے تو باآسانی نہیں نکل سکتا، لیکن اصل مسئلہ اس سے بھی گھمبیر ہے کہ وہ مغربی فکری سانچوں سے نکلنا ہی نہیں چاہتا کیونکہ وہ اسے ہی ترقی کی معراج سمجھتا ہے۔ ایک الجزائری مفکر مالک بن نبی نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے کہ "محکومانہ ذہنیت، محکومیت سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے"۔

بدقسمتی سے ہمارا نظامِ تعلیم سیکولرزم (Secularism) میٹریلزم (Materialism) اور ہیڈونزم (Hedonism) کے ارکانِ ثلاثہ پر ایمان بالغیب لانے کا نتیجہ ہے جو مغرب کے نیو کلونیلزم (Neo-colonialism) کا ماحصل ہیں۔ ہمارے نام نہاد دانشور اور فیصلہ سازی پر فائز مقتدرہ اوپر

بیان کئے گئے ازمز (Isims) کو ہی انسانی فکر اور معاشرہ کی ترقی وارتقاء کی بنیاد سمجھتے ہیں اور ہر وہ فکر جو ان ازموں سے ٹکراتی ہوا سے قدامت پسندی اور روایت پرستی قرار دیتے ہیں۔

کسی ملک یا معاشرے کا نظامِ تعلیم صرف یہ نہیں ہے کہ آپ نے نصاب کیا وضع کیا ہے، آپ کتابیں کون سی پڑھا رہے ہیں اور مختلف درجات میں طلبہ کے اختتامی امتحانات کیسے لیتے ہیں؟ بلکہ کچھ اور امور بھی نظامِ تعلیم کا بنیادی حصہ ہیں یعنی آپ تعلیم کون سی زبان میں دیتے ہیں، آپ تعلیمی اداروں میں کس طرح کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں ترتیب دیتے ہیں، طلبہ وطالبات کی اخلاقی تربیت اور شخصیت کی نشوونما کے لیے کیا پالیسی وضع کرتے ہیں، تعلیمی ادارے کے ماحول کو کس سانچے میں ڈھالتے ہیں نیز آپ لڑکوں اور لڑکیوں کی صنفی ضروریات پوری کرنے کا کیا اہتمام کرتے ہیں؟ مخلوط تعلیم (یعنی (Co-Education) کے ہونے یا نہ ہونے (یعنی (No Co-Education) کا تعلق اوپر بیان کئے گئے تمام امور سے ہے۔ گویا مخلوط تعلیم کوئی الگ تھلگ مسئلہ (Isolated Issue) نہیں ہے بلکہ نظام تعلیم کا اساسی اِشو ہے جس کا فیصلہ اس ذہنیت کی روشنی میں ہوتا ہے جو ذہنیت فیصلہ سازی کے مقام پر فائز ہے۔ بدقسمتی سے فیصلہ سازی کے مقام پر فائز ذہنیت (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) محکوم ذہنیت ہے جو کاغذی آزادی کے باوجود فکری آزادی سے محروم اور حمیتِ اسلامی سے تہی دامن ہے۔

پاکستان کا نظامِ تعلیم سیکولر ہے، اسلامی نہیں ہے

کوایجوکیشن یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم دینی نقطہ نگاہ سے مکمل طور پر ناقابلِ قبول ہے اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ دلائل دینے کی ضرورت نہیں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کو ناپسند فرمایا ہے نیز چونکہ تعلیم زندگی کے مفوضہ رول مئوثر طور پر ادا کرنے کے لیے تیار کرتی ہے اور اسلام کی رُو سے مرد وزن کے لائف رولز مختلف ہیں اس لئے ان کی تعلیم بھی مختلف اور علیحدہ ماحول میں ہونی چاہیے۔

آپ حیران ہوں گے کہ صرف اسلام ہی نہیں عیسائیت بھی مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دیتی۔

اب تو پتہ نہیں کیا صورتِ حال ہو۔ ۱۹۸۳ء میں مَیں نے ایک سال یونسکو فیلو شپ کے تحت آسٹریلیا میں گزارا۔ وہاں تعلیمی اداروں کی دو سٹریمز (Streams) تھیں، سرکاری تعلیمی ادارے اور چرچ کے تعلیمی ادارے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں تو مخلوط تعلیم تھی حتیٰ کہ یونیورسٹی لیول پر ہاسٹل بھی مخلوط تھے جب کہ چرچ کے تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم نہیں تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ چرچ کے تعلیمی ادارے معیارِ تعلیم کے لحاظ سے برتر اور اشرافیہ کے پسندیدہ تر ادارے تھے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ

اسلامی معاشرہ میں مخلوط تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح دوسرے آسمانی مذاہب (اگرچہ ان میں بہت تحریفات ہوچکی ہیں) بشمول عیسائیت اور یہودیت مخلوط تعلیم کے نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں سے مخالف ہیں۔ہم یہاں ایک ایسے عیسائی عالم کا نقطہ نگاہ پیش کرتے ہیں جو تعلیم کے شعبہ میں وسیع نظر رکھتا ہے اور وٹیکن کے نمائندے کے طور پر مخلوط تعلیم کی مخالفت کرتا ہے جان میکلاسکی نامی یہ عیسائی عالم جو کچھ کہتا ہے اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

خاندانی نظام اور مختلف اصناف کے باہمی تعلقات میں کچھ بنیادی گڑ بڑ ہوگئی ہے مثلاً کبھی کوئی یہ تصور کرسکتا تھا کہ تمام یورپی اقوام کی نمائندہ یورپین پارلیمنٹ یہ تجویز دے گی کہ ہم جنسی (Homosexual) تعلقات کو قانونی شادی کے برابر تسلیم کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اب عورت، عورت کی طرح کا رویہ نہیں رکھتی۔مرد، مرد کی طرح کا رویہ نہیں رکھتا اور خاندان کا شیرازہ پہلے کی طرح نہیں رہا۔خاندان جو تہذیب وتمدن کی اکائی تھا اور جو انسانی شرف کی نمائندگی کرتا تھا اب اُسے ایک متروک اور رجعت پسند تصور بنا دیا گیا ہے۔ہمیں ان مسائل کے حوالے سے بنیادی طور پر نظامِ تعلیم پر غور کرنا ہوگا جو انسان سازی کا بنیادی آلہ (Instrument) ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ امریکہ کے پبلک ایجوکیشن سسٹم میں اوائل عمری ہی سے اخلاقی اقدار کی نفی بالکل اظہر من الشّمس ہے۔ کیلی فورنیا ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن کے ایک سروے کے مطابق ۱۹۴۰ء میں شعبہ تعلیم کے بڑے بڑے مسائل یہ تھے: باری کا خیال نہ رکھنا، چیونگ گم چباتے رہنا، شور مچانا، کاریڈور میں دوڑتے پھرنا، قطار توڑنا، یونیفارم کے مطابق مناسب لباس نہ پہننا اور کوڑا کرکٹ پھیلانا۔

۱۹۸۰ء تک اخلاقی ضابطہ ڈرامائی طور پر بدل چکا تھا جس کا ۱۹۴۰ء میں تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

۱۹۸۰ء اور اس کے بعد کے رویوں میں انحراف کی صورت یہ تھی:

ڈرگ کا استعمال، شراب کا بے محابا استعمال، قبل از شادی حمل، خودکشی، زنا بالجبر، ڈاکہ زنی اور تشدد

۱۹۹۴ء کی انحرافی فہرست میں جو خرابیاں شامل ہوئیں ان میں بالترتیب سکولوں میں اسلحہ لے جانا، جنسی ہراس اور منتقل ہونے والی جنسی بیماریوں میں بے تحاشہ زیادتی۔ یہ مصنف سوال کرتا ہے کہ کس عمل نے معاشرتی تنزل کو ہوا دی ہے؟ مانع حمل ادویات کے استعمال میں زیادتی کس وجہ سے ہوئی ہے؟ طلاق کی شرح کیوں بڑھ گئی ہے؟ بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کیوں ہورہے ہیں؟ کثیر الافرادی تعلقات کی وجہ کیا ہے؟ مردوں کی آپس میں اور عورتوں کی آپس میں جنسی تعلقات کی وجہ کیا ہے؟ پرتشدد جرائم کیوں بڑھ گئے ہیں؟ فحش لٹریچر کی کثرت کس وجہ سے ہے؟ مصنف ان تمام خرابیوں کی

وجہ فطری قوانین سے روگردانی قرار دیتا ہے۔ وہ فطری قوانین جو مرد و زن کے ان کے فطری رول کی وضاحت کرتے ہیں اور جسے ہماری سوسائٹی ترقی اور لبرلزم کے نام پر پس پشت ڈالے ہوئے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان فطری قوانین کی خلاف ورزی کا آغاز تعلیمی اداروں سے ہوتا ہے جہاں مخلوط تعلیم ہے اور پھر مخلوط تعلیم کے یہ بُرے اثرات پورے معاشرے میں پھیلتے ہیں اور جن کا کوئی علاج نہیں سوائے اس امر کے کہ ان کی جڑ یعنی مخلوط تعلیم کو ختم کیا جائے۔ مذکورہ مصنف مخلوط تعلیم کے حوالے سے لبرلزم کے تمام دلائل کو مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نوعمری کے جنسی تعلقات، ایڈز، نوعمری کے حمل، خاندان کا انتشار، بے تحاشا انفرادی نفسیاتی امراض، معاشرے میں پھیلنے والے بے باپ کے بچے اور اسی طرح کی بے شمار سماجی خرابیوں کی اولین ذمہ دار تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ہے۔

وہ کہتا ہے کہ قدرت نے مرد و زن کے درمیان مکمل یک جہتی کی صرف شادی کی صورتِ میں اجازت دی ہے یا پھر رشتوں کے لحاظ سے ضرورت کے مطابق قریب ہونے کا راستہ دیا ہے۔ کسی اور لحاظ سے مرد و زن کا اکٹھے ہونا خالق کی مرضی کے خلاف ہے اور اس کی خلاف ورزی نقصان دہ ہے۔ ذرا اندازہ فرمائیں کہ کس طرح ایک عیسائی عالم مرد و زن کے اختلاط کو ناپسندیدہ قرار دے رہا ہے اور عالم بھی وہ جو ہمارے لبرلز کے پسندیدہ ملک امریکہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں ہم ایک مسلم دانشور کا نقطۂ نگاہ ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں: ''آہن گر محمد سمیع نے مخلوط تعلیم پر ایک فکر انگیز مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

مغربی تہذیب کی لعنتوں میں سے ایک لعنت جس سے معیارِ تعلیم تباہ ہو رہا ہے وہ ہے مخلوط تعلیم۔ اسلامی معاشرے میں مخلوط تعلیم کا تصور ایک معاندانہ تصور ہے جسے کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مخلوط تعلیم کا یہ نظام بیسوی صدی کے آغاز میں سکاٹ لینڈ میں شروع ہوا۔ بعد میں انگلستان کے کئی ایک سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں نے اس سسٹم کو اختیار کر لیا۔ تحریک نسواں کے کارکنوں نے ۱۹۵۰ء سے مخلوط تعلیم کے توسیعی تصور کو آگے بڑھانا شروع کر دیا تا کہ نہ صرف مرد و زن کام کی جگہوں پر ران سے ران ملا کر بیٹھیں بلکہ سکولوں میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے جبڑے اور گال آپس میں ٹکرائیں۔ فی زمانہ اسلامی دنیا میں بہت سی این جی اوز نے یہ ذمہ داری اُٹھائی ہے جو مغربی فنڈ نگ سے مخلوط تعلیم کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف مغرب میں مخلوط تعلیم کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر کئی ایک دانشوروں نے سنگل سیکس ایجوکیشن کے حق میں راہ ہموار کرنا شروع کر دی ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ہی کلاس روم میں بٹھا کر جو نقصانات اور خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ نفسیاتی بھی ہیں اور حیاتیاتی بھی۔ مشہور اسلامی سکالر ابن حزم (ت 456ھ) اپنی کتاب طوق الحمامہ

میں جو کہ محبت کنندگان کی نفسیات کے بارے میں ہے مخلوط مجالس میں پیدا ہونے والے عوارض کے سلسلہ میں بیان کرتا ہے کہ وہ اسلامی زندگی کے لیے اجنبی اور انہونے عوارض ہیں نیز مرد وزن میں ایسے رویے اور ایسی نفسیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو پسندیدہ نہیں ہوتی۔

جدید اور لبرل سوچ والے لوگوں کو شاید یہ بات سادگی اور سطحی سوچ پر مبنی محسوس ہو لیکن جدید سائنسی تحقیق بھی مخلوط تصور تعلیم کی تائید نہیں کرتی۔ ایک امریکن مصنف جارج گلڈر اپنی کتاب (Men and Marriage) میں لکھتا ہے کہ مخلوط تعلیم میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں قبل از وقت بلوغت کی سٹیج کو پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ہیریٹ ہنلن نے جو ورجینا ٹیکنیکل یونیورسٹی میں خاتون سائنسدان ہیں، 284 لڑکوں اور 224 لڑکیوں کی ذہنی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا جن کی عمریں 6 ماہ سے 16 سال تک تھیں۔ اس نے نتیجہ نکالا کہ ذہن کے وہ مراکز جو زبان دانی سے متعلق ہیں وہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں میں 6 سال تک زیادہ ترقی یافتہ تھے اس کے مقابلہ میں (Spatial Ability) یعنی مکانی ذہانت اور یاداشت کے حوالے سے لڑکے لڑکیوں سے 4 سال آگے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں ریاضی، جغرافیہ، فزکس اور لسانیات کی تعلیم کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح لڑکے اپنی انگلیوں کا ارتباط لڑکیوں کی نسبت 9 ماہ بعد سیکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکوں کی انگلیوں کے اعصاب لڑکیوں کی انگلیوں کے اعصاب کی نسبت بعد میں نشوونما پاتے ہیں۔ ہاتھ کی انگلیوں کا یہ عشری ارتباط ڈرائنگ اور خوش خطی سیکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف اذہان اور مختلف صلاحیتوں کے حامل لڑکوں اور لڑکیوں کو جب کہ ان کے مستقبل کے لائف رولز بھی مختلف ہیں، ایک ہی چھت تلے بٹھا کر ایک طرح کی تدریس کس طرح منصفانہ ہوسکتی ہے اس میں لازماً کسی ایک صنف کی حق تلفی تو ہوگی۔ یہ بات ان لوگوں کے سوچنے کی ہے جو انفرادی انسانی حقوق اور 'انصاف سب کے لیے' کے علم بردار ہیں۔

یہ کہنے کے بعد کہ اسلام مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دیتا ہم سیکولر نقطہ نگاہ سے بھی اس کا جائزہ لے لیتے ہیں۔ یہ جائزہ ہم تین پہلوؤں سے لیں گے:

نفسیاتی پہلو (Psychological Aspect)

انسانی نفسیات (Human Psychology) کے شعبہ میں جدید ترین تحقیق ہمیں لڑکوں اور لڑکیوں کے انفرادی اختلافات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی فزیکل ڈویلپمنٹ عمر کے کے مختلف ادوار میں مختلف ہوتی ہے۔ ان کی ذہنی نشوونما کا پیٹرن بھی مختلف ہوتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے Attitudes, Social Behavior, Aptitudes, Interests مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے Developmental Tasks میں اختلاف ہوتا ہے۔

اگر ہم جدید نفسیات کی تحقیق پر مبنی یہ سب باتیں مان لیں تو لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ہی کلاس روم میں بٹھا کر ایک ہی طرح کی Educational Treatment دینا کسی ایک صنف سے لازماً نا انصافی ہوگی۔

معاشرتی پہلو (Sociological Aspect)

سماجی طور پر لڑکیوں اور لڑکوں نیز مردوں اور خواتین کے رول مختلف ہیں، سوشل ریلشنز مختلف ہیں، سماجی طور طریقے مختلف ہیں اور سوشلائزیشن کے انداز مختلف ہیں۔ تعلیم سماجی تربیت کرتی ہے جب کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی سماجی ضروریات، سماجی رویے اور سماجی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں تو ایک چھت تلے مخلوط تعلیم سماجی نشوونما کے تقاضے پورے نہیں کرسکتی۔

تعلیمی پہلو (Educational Aspect)

یہاں تعلیم سے مراد نصاب اور تدریس نصاب ہے۔ زندگی کے الگ الگ رولز نبھانے کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ نصاب کی ضرورت ہے۔ یہ تو تسلیم کہ نصاب کے کچھ حصے مشترک ہوں گے لیکن ان مشترک حصوں میں بھی عملی اور اطلاقی پہلو میں صنفی ضروریات کے مطابق فرق رکھنا پڑے گا۔ بعض نصابی لوازمات میں عملی اور اطلاقی پہلو ایسے ہوں گے جن کا بیان لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط کلاس میں ممکن نہیں ہوگا۔

دوسرا پہلو جو تدریس نصاب (یعنی Delivery of Curriculum) سے متعلق ہے اس میں بھی بعض اوقات صنفی فرق ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ بیالوجی، فزیالوجی اور سائیکالوجی پڑھاتے ہوئے کئی مقامات ایسے آتے ہیں جہاں استاد کے لیے مخلوط کلاس روم میں کھل کر بات کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اگر ایسا کرے تو کم از کم پاکستان کی حد تک کلاس روم کا ماحول پُر تقدس نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر کوئی ادارہ اخلاقی اور شرعی تعلیم و تربیت کا دعویٰ کرتا ہے تو لڑکوں اور لڑکیوں کے اکٹھے بٹھانے میں بامقصد بات نہیں کی جاسکتی۔

ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں تو لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھے رکھ کر ایسی سرگرمیاں سرانجام دینا کھلم کھلا بے حیائی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جو بدقسمتی سے ہمارے بہت سے سرکاری اور

پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں ہو رہا ہے اور اس کے نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ میں یہاں مثالیں دینا شروع کروں گا تو شاید اس مخلوط ماحول میں جو پردہ داری کے ساتھ مخلوط ہے ممکن نہیں ہوگا۔

مخلوط تعلیم کے چند ایک فوائد جو اس کے حامی گنواتے ہیں

۱۔ مخلوط تعلیم کا ماحول لڑکوں اور لڑکیوں میں باہمی اعتماد کا ایک جذبہ پیدا کرنے میں معاون بنتا ہے۔

۲۔ مخلوط تعلیم کے ادارے طلبہ و طالبات کو حقیقی دنیا کے تجربات اور احوال سے روشناس کراتے ہیں۔

۳۔ مخلوط تعلیم صنفی مساوات کے تصور کو پورا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ مخلوط تعلیم، تعلیمی مصارف کے لحاظ سے معاشی طور پر زیادہ سودمند ہے۔

اوپر بیان کئے گئے فوائد شاید صرف سیکولر اذہان کو اپیل کریں لیکن قدرت کے قوانین پر نظر رکھنے والا شخص ان فوائد کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے اور اگر یہ فوائد ہوں بھی تو جو خطرات اور نقصانات سامنے آتے ہیں ان کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

نقصانات

۱۔ مخلوط تعلیم کا ماحول طلبہ و طالبات میں مطالعاتی انتشار (Study distraction) کا باعث بنتا ہے۔

۲۔ مخلوط تعلیم میں جنسی مسائل جنم لے سکتے ہیں جن کا ہم شروع کی سطور میں ذکر کر چکے ہیں۔

۳۔ ہماری نظر میں مخلوط تعلیم معاشرے پر بھی اور فرد پر بھی بُرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔

۴۔ طالبات کی تعلیمی حق تلفی۔ لڑکیاں فطرتاً شرمیلی طبیعت کی ہوتی ہیں، اس لیے مخلوط تعلیم میں ان کی Class Participation متاثر ہوتی ہے۔

۵۔ مخلوط تعلیم میں طلبہ و طالبات ذہنی انتشار کا شکار رہتے ہیں جس سے ان کے تعلیمی معیار پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

۶۔ خاندانی نظام متاثر ہوتا ہے۔ والدین کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

۷۔ موجودہ ماحول میں جنسی بے راہ روی بے لگام ہوجاتی ہے۔

۸۔ جنسی بلوغت کا دورانیہ جلدی شروع ہو جاتا ہے جس سے کئی ایک معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

۹۔ معاشرہ انتشار کا شکار ہوجاتا ہے، طلاق کی شرح بڑھ جاتی ہے اور ٹوٹے گھرانوں کے بچے بدترین مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں۔

۱۰۔ اکیلی ماؤں کا کلچر پیدا ہوتا ہے۔

۱۱۔ تعلیم کے بہت سے پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔

زبان وادب، شعروشاعری، آرٹ اور کلچر، صحت اور فزیالوجی اور فقہ کے مسائل پر کھل کر گفتگو نہیں ہوسکتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حجابِ نظر ختم ہوجاتا ہے جو بقول ماہرالقادری

آنکھوں کی تشنگی کا تجھے تجربہ نہیں
تم دیکھتے رہو گے تو بڑھتی رہے گی پیاس

ہماری حکومتوں کا رویہ اور مخلوط تعلیم

ہمارا قانون ڈگری کلاسز تک مخلوط تعلیم کی ممانعت کرتا ہے اور قانون کے مطابق صرف یونیورسٹی سطح پر مخلوط تعلیم کی اجازت ہے۔

آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ اگر کسی نے کوئی پرائیویٹ ادارہ کھولنا ہو تو محکمہ تعلیم سے رجسٹریشن نیز بورڈ اور یونیورسٹی سے الحاق کے لیے ادارے کی انتظامیہ کو 100 روپے کے اسٹامپ پیپر پر یہ حلف نامہ دینا پڑتا ہے کہ ادارے میں مخلوط تعلیم ہے اور نہ اس کی جازت دی جائے گی۔ اگر یہ حلف نامہ نہ دیا جائے تو تعلیمی ادارہ نہ تو رجسٹر ہوسکتا ہے اور نہ ہی بورڈ یا یونیورسٹی سے الحاق ہوسکتا ہے۔ یہ تو ہے قانونی صورتِ حال لیکن اس قانون سے انحراف خود حکومت بھی کرتی ہے اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے بھی حتیٰ کہ وہ جو مخلوط تعلیم کے خلاف قرار دادیں پاس کرتے ہیں اور اس کے خلاف تحریکیں چلاتے ہیں وہ بھی دھڑلے سے اس قانون سے انحراف کرتے ہیں۔

حکومت پنجاب نے یہ ظلم کیا ہے کہ اپنے سکولوں میں پرائمری سطح تک مخلوط تعلیم کو رواج دیا ہے نہ صرف لڑکے لڑکیاں اکٹھے بیٹھتے ہیں بلکہ مرد اور خواتین اساتذہ بھی اکٹھے ہیں۔ اس سے جو جنسی خرابیاں

پیدا ہورہی ہیں وہ نا قابل بیان ہیں۔ راقم الحروف کچھ عرصہ پہلے لاہور میں کچھ سرکاری سکولوں کی نگرانی اورسہولتوں کی بہم رسانی کا کام کر رہا تھا۔ جب بھی ہیڈ مسٹریس یا ہیڈ ماسٹر صاحبان سے پوچھا کہ آپ کا سب سے تکلیف دہ مسئلہ کیا ہے تو ان کا بیان ہوتا کہ پرائمری سطح پر مخلوط تعلیم۔ تفصیل پوچھی جاتی تو بتاتے کہ چوتھی پانچویں جماعت میں لڑکوں اور لڑکیوں کو بے حیائی سے روکنا مشکل ہوتا ہے اوران کی وجہ سے نچلی کلاسوں کے بچے بھی خراب ہورہے ہیں۔ ٹی وی پروگرام، ڈراموں، اشتہاری مواد اور کارٹون نیٹ ورک کے پروگراموں کو دیکھنے والے پانچ سال کے بچے بھی اب جنسی شعور کے حامل ہوتے جارہے ہیں اور جب وہ مخلوط کلاسز میں بیٹھتے ہیں تو وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ ٹی وی چینلز پر دیکھتے ہیں۔

ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کے سربراہ نے (جس کی اپنی یونیورسٹی میں اب Perfect Coupling نظر آتی ہے)ایک دفعہ بتایا کہ لاہور کی ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کی ایم بی اے کی کلاس میں 16 لڑکے اور 16 لڑکیاں تھیں۔ گریجوایشن سے پہلے ان سب نے آپس میں شادیاں کرلیں۔ شادی تو ظاہر ہے ایک پسندیدہ عمل ہے لیکن موصوف کا کہنا تھا کہ شادی سے پہلے جو کچھ ہوا ہوگا وہ اس معاشرے میں نا قابل تصور ہے۔ یہ ہیں مخلوط تعلیم کے نتائج جن کا ہمارے معاشرے کو سامنا ہے۔

مخلوط تعلیم اور والدین کا رویہ

ایک زمانہ تھا کہ بعض والدین اپنی لڑکیوں کو یونیورسٹی میں داخل نہیں کرا سکتے تھے کہ وہاں مخلوط تعلیم کا گند ہوگا۔ خواتین یونیورسٹی کے حق میں سب سے زیادہ مضبوط دلیل یہی ہوتی تھی کہ ایسے والدین کی لڑکیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق ملنا چاہیے جو مخلوط تعلیم پسند نہیں کرتے لیکن اب خواتین یونیورسٹیوں کی اچھی تعداد آنے کے باوجود والدین کی وہ مزاحمت باقی نہیں رہی۔ حیرت اس بات کی ہے کہ دینداری کا پرچم بلند کرنے والے اکثر والدین اب بزعم خود ماڈرن کوالٹی ایجوکیشن کے نام پر کوایجوکیشن کو سرے سے بُرا نہیں سمجھتے اور سنگل سیکس ایجوکیشن کے مواقع ہونے کے باوجود کوایجوکیشن کی طرف لپکتے ہیں۔

پس چہ باید کرد

ہمارا معاشرہ مخلوط تعلیم کی دلدل میں مکمل طور پر دھنس چکا ہے جبکہ مغرب میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہورہی ہے۔ شاید ہم بھی خاندانی نظام اور سماجی تانا بانا مکمل تباہ کرنے کے بعد ہی لوٹیں لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ مثبت اسلامی سوچ رکھنے والا طبقہ پورے زور سے اس کے خلاف تحریک چلائے۔ حکومت کو بھی اس انحراف سے روکا جائے اور والدین کو بھی مخلوط تعلیم کی تباہ کاریوں سے آگاہ کیا جائے۔

تعلیم و تربیت

محمد دین جوہر☆

تعلیم اور اکبر الٰہ آبادی

جدید تعلیم کی درسگاہیں یا قتل گاہیں

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

لسان العصر اکبرالٰہ آبادیؒ (۱۹۲۱-۱۹۴۶ء) کا یہ شعر ان کی سماجی اور تہذیبی بصیرت کا شاہکار ہے لیکن ہم نے اپنی نادانی میں اسے ایک لطیفہ سمجھ کر گنوا دیا۔ استعمار کے زیر سایہ ہمارے قومی ضمیر نے 'ناخوب' کو 'خوب' بنانے کا جو تاریخی سفر کیا ہے اس سے چیزوں کو دیکھنے کا ہمارا بنیادی تناظر ہی ختم ہو گیا ہے، کیونکہ اب بینائی اور تناظر دونوں مستعار ہیں۔ اس سفر میں جب ہم نے قومی ترقی کی منزل مراد پالی، اور خوب و ناخوب کا شعور ہی الٹ گیا تو دو انتہائی کارآمد مقولے بھی ہمارے ہاتھ لگے۔ پہلا یہ کہ ''مغرب نے ساری ترقی اسلام کی روشنی میں کی ہے'' اور دوسرا یہ کہ ''جو چیز اچھی ہے وہ لے لو اور جو چیز بری ہے وہ چھوڑ دو۔'' اول الذّکر اب ہمارا کل علم ہے جس کا مقصد باطل کی خوشنودی حاصل کرنا ہے اور مؤخرالذکر ہماری کل حکمت عملی ہے جس کا مقصد باطل کی مدام کاسہ لیسی ہے۔ اسی رفعت شان کے باعث اس شعر میں موجود حکمت ہمارے نئے ذوق پر بڑی گراں گزرتی ہے، اور ہم اسے ایک ظریفانہ اسراف سمجھ کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر استعمار اور اس کے زیر سایہ ترقی کے شوق میں ہمارے ہاں شاعری کے خلاف جس طرح کی ثقافتی اور تعلیمی فضا قائم ہوئی، اس سے اکبرؒ کی بصیرت تک رسائی اور بھی مسدود ہو گئی لیکن اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ اس شعر میں جو بات کہی گئی ہے اسے کسی طرح کے عقلی مبحث میں بیان کرنے اور زیر بحث لانے کے ہمارے ہاں ذہنی وسائل پیدا نہ ہو سکے، اور علوم کے انحطاط اور اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ہم اکبرؒ کی بات کو سماجی اور نظری علوم کے کسی مبحث میں منتقل کرنے کی اہلیت بھی پیدا نہ کر سکے۔ یہ شعر تاریخی صورت حال کی طرح ہمارے ہم عصر حالات سے بھی غیر معمولی Relevance رکھتا ہے لیکن اپنے ذوق کے تحول اور ذہن کے انہدام کی وجہ سے ہم اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکے۔

☆ ماہر تعلیم، دانشور، مدیر سہ ماہی 'جی' لاہور

اس شعر میں اکبرؒ نے کوئی سوال تو نہیں اٹھایا، بس کالج کی تعلیم اور اس کے اخلاقی اور سماجی نتائج پر ظریفانہ انداز میں ایک نہایت بلیغ اور حتمی بات کی ہے۔ اَن کہے ذہنی سوالات، روندتے تاریخی حالات اور اکھاڑتے تہذیبی امکانات کے سامنے یہ اکبرؒ کا شعری جواب (Poetic response) ہے۔ نظری اور فکری سوال اُٹھانا شاعری کا منصب نہیں ہے کیونکہ یہ نظری اور سماجی علوم کی ذمہ داری ہے، اور ہمارے ہاں ان کے جو حالات ہیں وہ معلوم ہیں۔ استعمار نے اپنے غیر معمولی طاقتی، ثقافتی اور تعلیمی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے بےنسب باتوں کا ایک ریوڑ مستعمر اقوام کی طرف ہانک دیا تھا، اور ہمارا گزارا ابھی انہی پر ہونے لگا اور اب تک ہے۔ اصواتِ ہرکارہ (minion voices) پر لگے اقوال آوارہ کے اس ڈکارتے ریوڑ میں اکبرؒ کی بات بھلا کسی طرح نبھ سکتی تھی؟

اکبرؒ کا یہ شعر ایک جمالیاتی اذعان (aesthetic judgement) ہے۔ اس کو ایک عقلی اور فکری مبحث میں کیونکر منتقل کیا جا سکتا ہے؟ جمالیاتی مدرکات کا منشاء ایک تجربہ ہوتا ہے اور نظری مبحث ایک اصول کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ تجربے کے بیان کی اثر انگیزی ہر معاشرے میں پائی جانے والی مشترک تہذیبی داخلیت پر ہوتی ہے، اور نظری مبحث کا قیام اور جواز اصول سے فراہم ہوتا ہے۔ تجربے میں جذبہ، فراست اور اخلاقی شعور مل کر ایک تاثر کی تشکیل کرتے ہیں جو شعر میں crystallize ہو جاتا ہے۔ تاثر ایک انفعالیت رکھتا ہے اور اس میں جذبہ، فراست اور اخلاقی موقف بے درز آمیز ہوتے ہیں کہ جذبہ غالب اور ظاہر ہوتا ہے۔ محملِ تاثر میں سوچ محجوب یا خفتہ ہوتی ہے اور فوری دسترس میں نہیں ہوتی جب کہ جذبہ متحرک اور اثر انگیز ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا تاثر کا ایک بڑا جز فراست ہے اور یہ عصری تاریخ کے سامنے انسان کی مجموعی پوزیشن کا نام ہے اور unarticulated سوالات کا محل یہی فراست ہے۔ اگر ہم اس فراست میں بالقوہ موجود سوالت کی بول سازی (articulation) کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اس شعر کے محتویات کو نظری مبحث میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ہماری عصری ضروریات ایسی ہو گئی ہے کہ ہمیں ہنگامی بنیادوں پر اکبرؒ اور اقبالؒ کے جمالیاتی مدرکات کو نظری اور فکری مباحث میں منتقل کرنے کا کام کرنا چاہیے تا کہ اپنی بقا کے امکانات کو اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔

آگے چلنے سے پہلے ہم علمی یا نظری مبحث کے بارے میں کچھ مبتدیانہ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کچھ تجربات اور معلومات کا حامل ہوتا ہے اور یہ تجربات اور معلومات اس انسان کے لیے valid ہوتی ہیں، لیکن دوسروں کے کام نہیں آتیں۔ اگر ان تجربات اور معلومات میں اصول کو داخل کر دیا جائے تو دوسرے انسانوں سے اشتراک کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ علم میں اصول ایک ایسے راستے یا پل کی طرح ہوتا ہے جو دو چیزوں میں تعامل اور ابلاغ کو ممکن بنا دیتا ہے۔

اصول کے چار پہلو انتہائی اہم ہیں، جن کے بغیر وہ اصول نہیں کہلا سکتا۔ اصول کا ایک سرا انسانی شعور میں کارفرما ہوتا ہے جہاں وہ اس کے عقلی وسائل، طریقۂ کار اور نظامِ استدلال کو متعین کرتا ہے، اور دوسرا سرا شعور سے باہر معاشرے یا تاریخ یا وجود میں کارفرما ہوتا ہے اور انسانی شعور کی کارفرمائی کے منطقے (domain) کا تعین کرتا ہے۔ تیسرا پہلو اصول کا جامع (inclusive) ہونا ہے، یعنی اصول منطقۂ تحقیق کو متعین کر کے اسے علمی سرگرمی کا موضوع بناتا ہے اور چوتھی چیز اصول کا مانع (exclusive) ہونا ہے، یعنی اصول قائم ہوتے ہی بہت سی غیر متعلق چیزوں کو علمی سرگرمی سے خارج کر دیتا ہے۔ ان خارج شدہ چیزوں کے لیے کوئی اصول الگ سے قائم کرنا پڑتا ہے اور اسی طرح شعبۂ ہائے علوم (disciplines of knowledge) پیدا ہوتے ہیں۔ اصول سازی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عقلی، نظری اور فکری مبحث کو داخلی تضادات سے پاک رکھا جائے اور شعور کے سفر کا راستہ کھلا رکھا جائے۔ یہاں یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ انسانی شعور اور نفس اپنی کلیت اور فطری ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا۔ یہ بات کہنا بھی تحصیل حاصل نہیں ہوگا کہ علمی اور عقلی اصول انسان ساختہ ہوتے ہیں اور انسانی شعور کو فعال بنانے کی ایک سبیل ہوتے ہیں، اور اس کی کچھ وقتی اور تاریخی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

اکبرؒ نے اپنے شعر میں جو بات کی ہے وہ سادہ اور صاف ہے کہ ''اگر فرعون کو کالج بنانے کی سوجھ جاتی تو وہ اس ناکامی اور رسوائی سے بچ جاتا جو بچوں کے قتل عام سے اس کے نام لگی اور یہ کہ کالج بنانے سے اسے وہ مقاصد حاصل ہو جاتے جس کے لیے اسے نسل کشی جیسا کام کرنا پڑا۔'' اتفاق یا اختلاف سے قطع نظر، اس شعر کا معنوی محتویٰ یہی ہے اور یہ دوٹوک اور بہت بڑی بات ہے۔ اب اکبرؒ کے ہاں ایسی کون سی فراست تھی جو نئی تعلیم کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ فرعونی قتل عام بھی اس کے سامنے ہیچ ہے؟ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم فراستِ اکبرؒ کے unarticulated سوالات تک رسائی حاصل کریں اور انہیں نظری، عقلی اور سماجی علوم میں ایک مبحث بنا کر ان سے استفادے کی کوشش کریں۔ اکبرؒ کی فراست عصری حالات پر بہت گہری گرفت رکھتی ہے جو بہت تیزی سے استعمار کی ترجیحات پر تبدیل ہو رہے ہیں اور روایتی معاشرے کی ہر چیز کو نابود کرتے چلے جا رہے ہیں اور یہی عمل زیادہ تیزی کے ساتھ ہمارے عہد میں بھی جاری ہے۔ اگر تو ہم اس سے مطمئن ہیں تو پھر اکبرؒ کی کلی تدفین کر کے ہمیں شادکام ہو جانا چاہیے۔ اگر ہم تہذیبی اور دینی اعتبار سے موجودہ صورت حال سے غیر مطمئن ہیں تو ہمیں سنجیدگی سے ان امور کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شاعری سماجی یا تاریخی حالات کا روزنامچہ نہیں ہے۔ انسان اپنے تقدیری حالات (human condition) میں جن تجربات سے گزرتا ہے، شاعری اس کا بیان ہے۔ تقدیری حالات کی بساط پر

بہت سے نقوش یقینا تاریخ کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ بھی شاعری کے حاشیہ برداروں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر لیتی ہے، ورنہ شاعری کے گھیر میں تاریخ گم ہے۔ لیکن برصغیر میں انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخ اپنی پیشانی پر تقدیر کے تیور چڑھائے ہوئے تھی۔ شاعری سے باہر ہمارے کلچر اور تہذیب کی علمی، قانونی اور ثقافتی روایتوں میں اس نئی تاریخ کے ادراک کی نوعیت اور سطح نہایت پست اور سیاسی طرز کی ہے، تہذیبی نہیں ہے۔ یہ صرف اکبرؒ اور اقبالؒ کے ہاں ظاہر ہونے والی ہماری شعری روایت ہے جو تہذیبی سطح پر اس نئی تاریخ کے مقابل ہے۔ ان کے ہاں شاعری روزنامچہ یا صحافت بنے بغیر اسی تاریخ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے اور اس شاعری کا معجزہ یہی ہے کہ یہ نہ پتھرائی، اور نہ پتھر ہوئی۔ ایک ایسے لمحے میں جب ہماری تہذیب اپنے تمام مظاہر میں منہدم ہو چکی ہے یا سن ہو گئی ہے، یہ شاعری ہی ہے جو اپنے منصب سے بلند ہو کر نئی صورت حال سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ یہ ہماری شعری روایت میں ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ ان دو بزرگوں کی شاعری ماضی کی نسبت ہمارے موجودہ حالات میں کہیں زیادہ relevant ہے لیکن ہمارے تمام بندوبست ان کو طاق نسیاں میں رکھنے کے نہیں، بند کرنے کے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں اسکولوں اور کالجوں میں، اور تنقیدی علوم میں اشعار کی تشریح کا جو طریقہ کار رائج ہو گیا ہے اس سے متن کی زمین ہی ریگزار ہو جاتی ہے، نہالِ معانی کہاں جڑ پکڑے گا۔ کیا متن اور کیا معنی، سب خجل ہیں۔

فوری ضرورت کے پیش نظر مندرجہ ذیل پہلوؤں سے اس شعر کی تفہیم کا آغاز کیا جا سکتا ہے:

☆ فرعونی اور استعماری اصول فرمانروائی میں مماثلت

☆ طلسمِ فراعنہ اور جدید علم میں مشترک اقدار

☆ فرمانروائی اور علم کا باہم گٹھ جوڑ

☆ نئے طریقۂ قتل کی دریافت

☆ استعمارِ فرنگ کے سامنے فرعون کی ہیچمدانی

☆ لفظ 'افسوس' کا شعر میں غیر معمولی استعمال

اس شعر میں اکبر نے اپنے زمانے کی استعماری حکومت اور اس کی تعلیمی پالیسی کو پیش منظر میں رکھتے ہوئے پس منظر میں ایک ایسی تہذیب اور اس کے اسلوبِ فرمانروائی کا ذکر کیا ہے جس سے ہم اپنی مذہبی روایت میں بہت اچھی طرح باخبر اور مانوس ہیں۔ اس موازنے کا مقصود ایک ایسی بصیرت کا حصول ہے

جس کی مدد سے اس عہد کی ایک بالکل نئی اور مکمل طور پر غالب تہذیب کے اصول فرمانروائی اور اس کے دوررس مقاصد کو سمجھانا ہے، جو اس وقت پیش منظر میں ہے۔ اکبرؒ اپنی خداداد بصیرت سے تہذیب فرنگ کی حقیقت کا جو علم رکھتے تھے، اس کو اپنے سامعین تک علمی انداز میں پہچانے کا کوئی راستہ نہیں رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے فرعون کے قرآنی قصے کو پیرایہ اظہار کے طور پر استعمال کر کے اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ دیے بغیر اس شعر کی معنوی گہرائی تک رسائی نہیں ہوسکتی اور وہ یہ ہے کہ فرعونی قصہ ہمارے ایمان کا حصہ تو یقیناً ہے لیکن ہمارے تاریخی شعور میں اپنی کوئی علمی ثمر آوری نہیں رکھتا اور ہم اس قصے سے ایسی کوئی بصیرت حاصل نہیں کرتے جو عصر حاضر میں ہماری رہنمائی کر سکے اور ہم وحی کے اس لاریب علم سے تاریخی حالات کی تفہیم کی کوئی اہلیت پیدا کر سکیں۔ اکبرؒ نے تہذیب فرنگ کو فراعنہ کے مماثل قرار دیا ہے اور اس طرح کے کام تو ہم صبح شام کرتے رہتے ہیں، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس مماثلت کے علمی حاصلات کیا ہیں؟ اور اس عہد میں وہ ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ اس موازنے اور مماثلت کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ اس نئی تہذیب کو سمجھنے کے لیے اکبرؒ کو درکار علمی وسائل فراہم نہ تھے، لیکن انہوں نے علمی تناظر کی جگہ اپنی جمالیاتی روایت کا سہارا لیا اور تہذیب حاضر کی اصل نوعیت کے اظہار کا حق درجۂ کمال میں ادا کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ہم اس شعر پر مزید کوئی گفتگو کریں، ہم قرآن کے فرعونی قصے سے فی الوقت ضرورت کے لیے اخذ روشنی کی کوشش کریں گے۔

فرعون کا اصول فرمانروائی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر مبنی تھا، جس کی اساس نسل پرستی تھی۔ اس پالیسی کے عملی مظاہر میں genocide ریاستی پالیسی کا اہم ترین ستون تھا۔ دوسری طرف استعمار فرنگ کی فرمانروائی کے اہم ترین اصول بھی یہی تھے اور جس کا ہندوستانی تاریخ میں اظہار مسلسل اور بہت واضح ہے۔ امریش مشرا کے مطابق ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۷ء تک استعمار فرنگ نے ہندوستان میں ایک کروڑ سے زائد لوگوں کو ہلاک کیا اور یہ تعداد اس وقت کی ہندوستانی آبادی کا دس فیصد تھی۔ اور ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا کہ اس ظلم اور جبر کے تمام شواہد بھی ممکنہ حد تک مٹا دیے جائیں۔

علم اور ٹیکنالوجی میں فرعونی تہذیب عروج پر تھی اور episteme کا ساحری تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ کا پیغام پہنچایا تو فرعون نے اسی علم اور ٹیکنالوجی کی مدد سے اس کو پرکھنے کی کوشش کی اور رسول کا انکار کیا۔ مغرب بھی اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے علاوہ کسی چیز کو معیار ماننے کے لیے تیار نہیں اور اس کی قوت انکار بھی یہیں سے پھوٹی ہے۔ جو چیز ان کی لیبارٹری میں درست نہیں آتی وہ غلط ہے اور

مٹائے جانے کے قابل ہے، جس طرح فرعون کے ٹاور سے اگر خدا نظر نہیں آتا تو وہ ہے ہی نہیں۔ فرعون کی تہذیب میں ساحرانہ علم اور فرمانروائی کا باہم انحصار تھا اور ساحرانہ علم فرعونی فرمانروائی کا پالیسی ساز تھا۔ فرعون کی نسل کشی کی بنیاد بھی اسی علم پر رکھی گئی تھی۔ فرنگ کی استعماری پالیسی میں سائنس ان کے لیے معاون اور پالیسی ساز علم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ چند بالکل ظاہری مماثلتیں ہیں، جو اکبرؒ کے اس شعر کی بنیاد میں موجود ہیں، اور یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اکبرؒ نے نہایت فنکارانہ انداز سے اس موازنے میں فرعون کی بے چارگی اور بے بسی کو ظاہر کیا ہے، یعنی فرعون جس کے سامنے بیچارہ ہے وہ خود کیا ہوگا، وہ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ استعمارِ فرنگ کے سامنے فرعون محض ایک طفلِ مکتب ہے اور اہلِ فرنگ، ان کا اصولِ فرمانروائی اور ان کا علم اپنے اثرات میں اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اکبرؒ کو یہ ادراک اپنی دینی اور تہذیبی بصیرت کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس کا اسلوبِ اظہار بھی انہوں نے ایسا اختیار کیا کہ مذہبی ذہن کے لیے جدید تعلیم کی شناعت واضح ہو سکے۔ لیکن استعماری حکومت، اس کے غیر معمولی جبر، نئی ٹیکنالوجی اور نئے علوم کا اژدہام ایسا تھا کہ مسلم ذہن اس بات کو سمجھنے تو دور کی بات ہے سننے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ سن ستاون کے ظلم و جبر کے پہاڑوں سے نکلنے والے خون کے دریا میں جب سید صاحب نے نئے علم کی ناؤ ڈال کے جدید تہذیبی سفر آغاز کیا تو اکبرؒ کی سچی آواز اور بھی غیر اہم ہوگئی اور آہستہ آہستہ جدید زمانوں کے افتاں سفر کی خیزاں گرد نے ہماری آنکھوں کو اس قدر آلودہ کر دیا کہ ان کی تمام بصیرتیں ہی ہماری نظر سے اوجھل ہوگئیں۔

جدید علوم اور سحر فراعنہ میں مماثلتوں کا سراغ ایک غیر معمولی ادراک ہے، اور یہ اقبالؒ میں ہمیں زیادہ گہرائی اور وسعت سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ نیا علم کیسا ہے اور انسان کو کس رخ میں تبدیل کرنے والا ہے، اس کا بھرپور اظہار ہمیں اکبرؒ کے ہاں بھی ملتا ہے جہاں یہ بہت تیزی سے سماجی سطح پر ایک بالکل نئے انسان کو متعارف کرا رہا ہے۔ یہ نیا انسان کیسا ہے؟ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو جسمانی طور پر قتل کرتا تھا، لیکن جدید تعلیم اور جدید علوم انسان کو جسمانی طور پر تو زندہ رکھتے ہیں، لیکن اخلاقی اور روحانی طور پر اس کو بالکل مٹا دیتے ہیں۔ انسان کو اس طرح سے قتل کرنے کا خیال اور قتل کا یہ طریقہ فرعون کو معلوم نہیں تھا، لیکن فرنگ نے یہ 'ہنر' حاصل کرلیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ مقتول کی شکر مندی کا مستحق بھی بن جاتا ہے۔

منصۂ تاریخ پر حق و باطل کی جدلیات میں سحر اور جدید علم نے ہمیشہ زور اور زُور کا ساتھ دیا ہے جابرانہ سیاسی طاقت کو اپنے ظلم کی جواز سازی میں اسی علم نے بڑے بڑے نظریے قائم کرکے مدد فراہم کی

ہے۔ پھر جدید ریاست کی پالیسی کا اہم ترین ستون بھی اسی علم کی مسلسل پیداوار ہے۔ جدید ریاست کے خون آشام اور انسان سوز اداروں اور پالیسیوں کی تعمیر بھی اس علم کی کمک سے اٹھائی جاتی ہے۔ جدید ریاست کے اقتدار کی کارفرمائی کو فرد کی ذات کے نہاں خانوں تک وسعت دے کر مؤثر بنانے اور سرمایہ داری نظام کی ترجیحات کے مطابق انسان سازی کے تمام وسائل بھی جدید علم نے مہیا کیے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ جدید علم اور اس سے پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی دونوں اپنی نہاد اور مزاج میں حق کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد اپنی مربی سیاسی طاقت کی خدمت بجالانا ہے، کسی سچ کی پرورش کرنا نہیں ہے۔ جدید ریاست کی معاشی اور سیاسی پالیسی کو مرتب کرنے، اس کو جواز فراہم کرنے، اور اس کو ممکنہ خطرات سے بچانے کا کام جدید علم بالکل اسی انداز میں کرتا ہے، جس طرح فرعونی عہد میں ساحرانہ علوم نے اقتدار کو امکانی خطرات سے آگاہ کر کے ریاستی پالیسی بنانے میں معاونت کی تھی۔ آج کے تھنک ٹینک اور جامعات بالکل اسی انداز سے کام کرتے ہیں۔ مقصد یہاں بھی وہی ہے جو ساحروں کا تھا کہ جب اقتدار کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ان علوم نے غیر مشروط خدمت گزاری کی، اور واحد مطالبہ انعام واکرام کا کیا۔ آج کے اہل علم بھی اقتدار سے اپنی اعلیٰ خدمات کا سودا معاش کے عوض کرتے ہیں۔ اس علم کا مقصد یا ہدف کوئی سچ وغیرہ نہیں ہے، بلکہ ایسی چیزوں کو سچ ثابت کرنا ہے جن کو سچ ثابت کرنے کی ضرورت آن پڑی ہے۔

اس شعر میں جس قاتل کا ذکر ہے وہ اپنے ہنر میں کامل ہے اور اس نے اپنی حکومت کو بچانے کے لیے ساحرانہ علم کی مشاورانہ شرکت سے نسل کشی کی پالیسی کو علی الاعلان نافذ کیا ہوا ہے۔ اسے اپنی سیاسی قوت اور ٹیکنالوجی پر ناز ہے۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر یہ بات ہے کہ اکبرؒ اس قاتل کو بیچارہ سمجھ کر اس کی بے کسی اور نادانی پر افسوس کرتے ہیں۔ اکبر ان گنت معصوموں کے قتل پر افسوس کا اظہار نہیں کرتے، کیونکہ وہ تو فطری طور پر ان کے اور قاری کے رگ و پے میں ہے۔ لیکن اکبرؒ کی بصیرت ملاحظہ ہو کہ وہ 'افسوس' فرعون پر کرتے ہیں۔ یہ اظہار افسوس اس لیے ہے کہ انہوں نے فرعون سے بھی بڑے قاتل کو دیکھ لیا ہے، اور یہ نیا قاتل اپنی سفا کی، عیاری اور ہنرمندی میں فرعون سے بہت آگے کی چیز ہے۔ فرعون کی نسل کشی کی پالیسی فرنگ کے مقابلے میں بچوں کا کھیل تھی، کیونکہ فرعون بچوں کے قتل سے بدنام بھی ہوا اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی تو خیر کیا ہوئی، سلطنت ہی جاتی رہی۔ اس کا انداز بھی بہیمانہ، سفاکانہ اور 'غیر مہذب' تھا۔ فرنگ نے کام تو وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا، لیکن اسے اپنی نسل کشی کی پالیسی میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ قیامت تو یہ ہے کہ فرنگ نے اپنی نسل کشی کی عملداری کو مکاں تا زماں وسعت دے دی۔ اس صورت حال کا ستم ظریفانہ پہلو یہ ہے کہ فرنگ نے اُسی کام سے نیک نامی کمائی

جس کام پر فرعون کو آج تک پھٹکار پڑتی ہے، اور نیک نامی بھی ایسی کہ اس کے شکار اسی کو مسیحا جانتے ہیں۔ پھر یہ کہ فرنگ کا تعلیمی منصوبہ اور اس کی بنیاد میں کارفرما نسل کشی کی ریاستی پالیسی اس حد کامیاب ہوئی کہ اسے 'ترقی' اور 'بہتری' سے موسوم کیا جانے لگا اور کشتہ نسل اس کی سب سے بڑی ہم نوا بن گئی اور بنی رہی۔ دوسری طرف فرنگ نے اپنی فرمانروائی کو وقتی بندشوں سے آزاد کرلیا، اور اپنے معاشی مفادات کو عالمگیر غلبے اور تاریخی دوام پر استوار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس عمل قتل کی تکمیل کا عالم یہ ہے کہ مقتول اپنی شناخت تک بھی اب قاتل کے اشارے پر متعین کرتا ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اکبرؔ کالج کے کھلنے کو نسل کشی سے کیوں تعبیر کررہے ہیں؟ عرض ہے کہ جدید تعلیم دراصل ایک طویل عمل سرجری کے مشابہ ہے کہ انسان کے اندر سے اخلاقی، روحانی اور انسانی عناصر کو کھرچ کھرچ کر نکال دیا جائے، اور اس کی ظاہری اور جسمانی صورت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک انوکھا پن دے دیا جائے۔ فرعون اپنی تمام تر قوت کے باوجود اس علم اور طریقے تک نہ پہنچ سکا جہاں تک فرنگ نے رسائی حاصل کرلی، اسی لیے ''بیچارا'' کہلایا۔ وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا، لیکن فرنگ نے وہ مقاصد بدرجۂ اتم حاصل کرلیے۔ انسان کو جسمانی طور پر ختم کرنے میں عقل کی زیادہ ضرورت ہے یا اسے باطنی طور پر تعلیمی سرجری کے عمل سے گزار کر، اس کی شکل کو باقی رکھتے ہوئے، ایک غیرِ انسان کو تخلیق کرنے میں؟ یہ کام فرنگ نے کر دکھایا، اور اس کام میں فرعون کے پھوہڑ پن پر اکبرؔ افسوس کا اظہار کرتے ہیں، اور یہی افسوس کا اظہار ان کی طنز کا شاہکار بھی ہے۔

اکبرؔ جدید تعلیم اور نسل کشی یعنی قتل عام کو مماثل قرار دے رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں مماثلت کیا ہے؟ انسان ہونے کا مطلب صرف جسم نہیں ہے۔ انسان جسم، نفس اور شعور کا مجموعہ ہے۔ اگر اس کے نفس اور شعور کو جسم یا زیادہ وسیع معنوں میں طبعی فطرت کی ترجیحات پر تشکیل دے دیا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ کام تعلیم کے ذریعے باآسانی کیا جاسکتا ہے، کیونکہ انسانی شعور اور زبان میں وہی نسبت ہے جو پودے اور پانی میں ہے۔ اگر انسان کی زبان کو برباد کردیا جائے تو اس کے شعور کی تباہی ایک قابل حصول پالیسی ہدف بنایا جاسکتا ہے۔ استعماری تعلیم کا مرکزی نکتہ ہی اہل برصغیر کی زبان کی مکمل تباہی تھی جسے جدید تعلیم نے مکمل طور پر حاصل کرکے ایک روزمرہ حقیقت بنا دیا۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو جسمانی طور پر قتل کیا، لیکن استعمار نے یہاں کے لوگوں کو جسمانی طور پر زندہ رکھتے ہوئے ان کے شعور کو مکمل طور پر فنا کردیا اور یہ کارنامہ اس نے یہاں کی زبانوں کو برباد کرکے اور اس بربادی کو جدید تعلیم کے ذریعے مستقل بنا کر حاصل کیا۔ اب قتل اور نسل کشی کا یہ طریقہ تو فرعون کے گمان سے بھی باہر تھا۔ (بشکریہ سہ ماہی 'جی')

تعلیم و تربیت

اللہ داد نظامی

تعلیم کوئی مسئلہ ہی نہیں

'مسئلہ نظام تعلیم نہیں خود نظام ہے۔ اس کے لیے جو قربانی مطلوب ہے ہمارا طرزِ زندگی اس کا متحمل نہیں۔ اسلامی انقلاب ذہنی تفریح ہے۔ سو لوگ لطف اندوز ہوں۔'

(SMS اللہ داد نظامی، بلال اسلامک سنٹر۔ جھوک نواز، وہاڑی)

البرہان

اگر نظامی صاحب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیتے تو بہت سوں کا بھلا ہو جاتا کہ ہمارا طرزِ زندگی اسلامی انقلاب کے لیے قربانی دینے کا متحمل کیوں نہیں؟ دینی قوتوں نے اس کے لیے کیا منہج اختیار کیا اور وہ کیوں ناکام ہوگئیں۔ اور اب اس کا حل ان کی نظر میں کیا ہے؟

نظامی صاحب نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں لیا ہے لیکن یہ ایک سنجیدہ بات بھی ہے اور بہت نئی بھی نہیں۔ آج سے تقریباً ۶۰ سال پہلے نعیم صدیقی صاحب مرحوم نے اس تعلیمی کمیٹی میں یہ بات کہی تھی جو ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز پر غور کے لیے قائم کی گئی تھی کہ ہمیں ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لیے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے، جب ہم نظام بدلیں گے تو سارے ملک میں صحیح طرز کے تعلیمی ادارے قائم کر دیں گے چنانچہ وہ تعلیمی ادارہ قائم نہ کرنے کا فیصلہ ہوا☆۔ پھر نہ نظام بدلا جا سکا، نہ اسلامی انقلاب آیا اور نہ صحیح قسم کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ اور جب پلوں کے نیچے سے بہت سے پانی گزر گیا اور تحریک اسلامی کے لوگوں نے سیکڑوں نہیں ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کر لیے تو آج کل وہ بدقسمتی سے اسلام کی بجائے مغرب فکر و تہذیب کو پروموٹ کر رہے ہیں۔

تلخیصاً عرض ہے کہ اگر آپ کے نزدیک نظام سے مراد اجتماعی اور سیاسی نظام ہے تو اس کے لیے بھی عوام اور افراد کی حمایت درکار ہے جس کا بڑا ذریعہ رسمی و غیر رسمی تعلیم ہے اور اگر نظام سے مراد ساری زندگی ہو تو اس کا اولیں مخاطب تو ہے ہی فرد جس نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں اللہ کی فرمانبرداری کرنی ہے اور اللہ کو جا کر جواب دینا ہے۔ اور اس کا طریقہ جو اللہ نے سارے انبیاء خصوصاً آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا ہے وہ ہے تعلیم کتاب و حکمت و تزکیۂ نفس۔ مطلب یہ کہ دونوں صورتوں میں اصل مسئلہ تعلیم ہی ہے، **فافہم**۔

☆ یہ بات مولانا عبدالغفار حسن مرحوم نے پندرہ روزہ المنبر فیصل آباد میں لکھی جو جماعت اسلامی کی اس کمیٹی کے رکن تھے۔

تعلیم و تربیت مولانا محمد خان شیرانی ☆

دینی مدارس کا نصاب و نظام محتاج نظر ثانی ہے

مولانا محمد خان شیرانی نے جو جمعیت علماء اسلام (ف) کے مرکزی رہنما اور اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ہیں، ۱۳ مئی ۲۰۱۴ء کو لاہور میں جامعۃ الخیر میں علماء کرام کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب فرمایا۔ جس میں راقم (مدیر البرہان) بھی موجود تھا۔ منجملہ دوسری باتوں کے انہوں نے تعلیم کے حوالے سے دینی مدارس کی توجہ دو امور کی طرف دلائی۔ ایک یہ کہ دینی مدارس دینی و دنیاوی علوم کے جامع ہوا کرتے تھے لیکن انگریز نے ہندوستان پر قبضے کے بعد دینی مدارس سے ان علوم کو چھین لیا جو ریاست و سیادت کے لیے ضروری تھے چنانچہ لارڈ میکالے نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا اور وہاں نہ کوئی چور دیکھا نہ بھکاری اور نہ کوئی جاہل بلکہ سب پڑھے لکھے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی شوکت سے محروم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی جائے یعنی ان کے نظام تعلیم کو مفلوج کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کی بجائے (جو اس وقت ہندوستان کی دفتری زبان تھی) انگریزی میڈیم کو جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دینی مدارس سے عربی فارسی پڑھ کر نکلنے والے ملازمتوں سے محروم ہو گئے اور معاشرے سے کٹ کر رہ گئے۔ مولانا شیرانی نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء کرام انگریز کی اس سازش کو سمجھیں، اس سے باہر نکلیں اور اس کے تسلسل کو ختم کریں، دینی مدارس کے نظام و نصابات پر نظر ثانی کریں اور انہیں قدیم و جدید اور دینی و دنیاوی علوم کے جامع ادارے بنائیں۔

دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ تعلیم کے دو مقصد ہوتے ہیں، ایک معرفت رب اور دوسرے مدافعت نفس۔ معرفت رب کا مطلب یہ ہے کہ عالم داعی اور اعلاء کلمۃ اللہ کا علم بردار ہو اور مدافعت نفس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی محض اپنی بقاء کا سوچے اور ردّ عمل کا شکار ہو کر رہ جائے۔ دینی مدارس کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ پہلے مقصد تعلیم کے علم بردار ہیں یا دوسرے کے۔

☆ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

غلبۂ دین　　ڈاکٹر عبدالغنی فاروق ☆

سیاسی جدوجہد نہ مسلح جدوجہد

غلبۂ اسلام بذریعہ دعوت وصبر

ہمارے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کا ایک مضمون ''عالمی صلیبی جنگ کا مقابلہ کیسے ہو؟'' قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے تفصیل سے اہل مغرب کی چیرہ دستیوں، مظالم اور سازشوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امت مسلمہ مکی دور کی طرح کمزور اور بے بس ہے اور اسے کفر سے کشمکش اور جہاد کی بجائے دعوت بالقرآن اور صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر بلا تبصرہ شائع کر رہے ہیں۔ البرہان کے فاضل قارئین میں سے کوئی صاحب اگر اس پر تبصرہ کرنا چاہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ مدیر

[موجودہ صورت حال میں جب مسلمان سیاسی اور فوجی لحاظ ہی سے نہیں دینی اور اخلاقی لحاظ سے بھی کمزور ہیں اور عالم کفر (امریکہ، یورپ اور ان کے ہم نوا) غالب اور طاقتور ہے اور اس نے مسلمانوں پر صلیبی جنگ مسلط کر رکھی ہے اور مسلمان ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے تو]

''سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں مسئلے کا حل کیا ہے؟ کیا ہمیں اسی طرح ایک بے رحم چٹان سے سر ٹکراتے رہنا ہے یا بچاؤ کی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔ غور کریں تو ہماری حالت ہو بہو وہی نظر آتی ہے جس کی نشاندہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک پیش گوئی میں فرمائی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں تم پر اس طرح یلغار کریں گی جس طرح بھوکے کھانے پر یلغار کرتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضور کیا ہم اس وقت تھوڑے ہوں گے فرمایا نہیں تمہاری تعداد بہت ہوگی مگر تم وہن کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لوگوں نے وہن کا مطلب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا دنیا کی محبت اور موت کا خوف...... چنانچہ عبرت ناک منظر یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے نقشے پر بظاہر ۵۷ آزاد و خودمختار مسلمان ملک ہیں جن کی آبادی ڈیڑھ ارب سے زیادہ ہے اور جو دنیا کے بہترین معدنی اور غذائی وسائل سے مالا مال ہیں۔ جدید ترین اسلحے

☆ ادیب، دانشور، ماہر تعلیم، منصورہ، لاہور

سے لیس ہر ملک کی اپنی فوج ہے لیکن افسوس کہ سیاسی یا فوجی اعتبار سے ان کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے اور حال یہ ہے کہ تقریباً پچاس لاکھ آبادی کا ننھا منا اسرائیل کم وبیش دس کروڑ مسلمان عربوں کے لیے خوف اور ہزیمت کا سبب بنا ہوا ہے اور کوئی مسلمان ملک اس کا کچھ بھی بگاڑنے پر قادر نہیں ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آج ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں اس میں مختلف دشمن ممالک کی سازشیں کارفرما ہیں۔ کم وبیش سارے ہی مسلمان ممالک کے مذہبی اور سیاسی رہنما اسی پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں امریکہ، اسرائیل اور بھارت ملوث ہے۔ ایک عرصے تک خود میں بھی اسی نقطہ نظر کا حامی رہا لیکن قرآن پاک کی ایک آیت سامنے آئی اور اس پر غور کیا تو میری آنکھیں کھل گئیں اور میری رائے میں انقلابی تبدیلی آ گئی۔ سورۂ آل عمران میں ہے (آیت ۱۲۰) ترجمہ: ''یعنی اگر تم صبر پر کاربند ہو جاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر لو تو دشمنوں کی کوئی چال یا سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن تو سازش کرے گا، اسے تو ہم اس حرکت سے روک نہیں سکتے لیکن یہ سازشیں اس وقت کامیاب ہوں گی جب ہمارا اندرون کھوکھلا ہو جائے گا اور ہم صبر اور تقویٰ کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیں گے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کم وبیش سارے ہی مسلمان ممالک دنیا جہاں کی خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ خوف خدا کی کمی کا شدید ترین بحران ہے، حتیٰ کہ مذہبی اور دینی حلقوں میں بھی تقویٰ اور سچی خدا پرستی کے مظاہر بہت کم نظر آتے ہیں اور کتابوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ مادہ پرستی اور زراندوزی منہ زور طوفان کی طرح ہر جگہ چھا گئی ہے اور ناجائز مال ومتاع کے نتیجے میں ہر طرح کی اخلاقی خرابیاں مسلمان معاشروں میں راہ پا گئی ہیں۔ رشوت کا چلن عام ہے اور جھوٹ، بددیانتی، نفاق اور ظلم کا تناسب بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ خصوصاً اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے وطن عزیز...... پاکستان...... میں ساری ہی قباحتیں اپنے عروج پر نظر آ رہی ہیں۔ سنگ دلی اور سفاکی ہمارے معاشرے کی روایت بنتی جا رہی ہے۔ بے حسی اور بے رحمی کا یہ عالم ہے کہ بلاشبہ سینکڑوں جانیں پتنگ بازی اور دھاتی ڈور کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ شادی بیاہوں میں فائرنگ کے نتیجے میں ان گنت بے گناہ لوگ مارے جا چکے ہیں۔ ون ویلنگ کے حوالے سے بے شمار حادثات رونما ہو چکے ہیں لیکن متعلقہ لوگ ان انتہائی ہولناک اور مہلک مشاغل کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہو رہے، دہشت گردی اور خودکش دھماکوں کا لامتناہی سلسلہ اس پر مستزاد ہے اور حکمرانوں کے احمقانہ اور ناقابل فہم رویے عالم اسلام کو ایک تنگ، اندھی گلی میں لے آئے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

اس انتہائی خطرناک صورتحال میں عالم اسلام کے رہنما حضرات کی وہی کیفیت ہے جس کی

نشاندہی علامہ اقبال کے ملفوظات میں نظر آتی ہے کہ مسلمان پچھلے چار سو سال سے خواب وخیال کی دنیا میں رہ رہے اور زمینی حقیقتوں کا نہ ادراک رکھتے ہیں نہ احساس۔ایک حدیث نبوی ﷺ ہے کہ مسلمان اپنے زمانے کے حالات سے باخبر ہوتا ہے،لیکن خصوصاً مذہبی حوالے سے ہمارے ہاں ایسے رہنما بھی ہیں جنہیں نہ اپنی کمزوریوں کا احساس ہے نہ دشمنوں کی طاقت کا ادراک، نبی اکرم ﷺ کے مکی دور کا مشہور واقعہ ہے،حضرت ابوبکر صدیق t نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ کفار کے ظلم وستم بڑھتے ہی جارہے ہیں ہمیں بھی اجازت دیجیئے کہ ہم ان کا مقابلہ کریں تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا:''اے ابوبکر صبر کرو ہم تعداد میں تھوڑے ہیں۔''

کچھ عرصے کے بعد یہی گزارش حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کی اور اس کے جواب میں بھی نبی اکرم ﷺ نے وہی بات ارشاد فرمائی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی پوری حیات مقدسہ میں زمینی حقیقتوں کو پیش نظر رکھا اور کبھی بھی جذبات میں آکر دشمن سے ٹکرانے کی جلدی نہیں کی۔طلوع اسلام کے بعد تیرہ سال کا عرصہ آپؐ نے مکہ مکرمہ میں اس طرح گزارا کہ کعبۃ اللہ بتوں سے بھرا ہوا تھا جبکہ کفار نے اہل اسلام کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی،لیکن آپؐ نے کبھی کسی بت کو نہیں چھیڑا اور کفار کو چڑانے کی کوشش نہیں کی اور جب دیکھا کہ مکہ میں اشاعت اسلام کا عمل مشکل ہورہا ہے تو رات کے اندھیرے میں ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں یہودیوں کی خاصی بڑی آبادی تھی۔ وہ بہت امیر تھے اور کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھے چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان کی سماجی اور سیاسی حیثیت کے مطابق ان کی اہمیت کو تسلیم کیا اور ان سے امن اور اتحاد کا معاہدہ کیا اور یہ معاہدہ اس وقت تک قائم رہا جب تک خود یہودیوں نے اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

اسی طرح عبداللہ ابن ابی (رئیس المنافقین) کی مدینہ میں بڑی حیثیت تھی۔ یہ شخص بظاہر مسلمان ہوگیا تھا لیکن در پردہ اسلام کی شدت سے مخالفت کرتا رہا۔حضور ﷺ نے مصلحت اور زمینی حقائق کے مطابق اس سے محاذ آرائی نہیں کی اور اس کی انتہائی اشتعال انگیزیوں کے باوجود اسے برداشت کیا حتیٰ کہ مدینہ کے معاشرے میں یہ اچھوت بن گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں کم وبیش ۸۰ جنگیں لڑی گئیں اور وہ تقریباً سب کی سب دفاعی نوعیت کی تھیں۔ان سب جنگوں میں آپؐ نے زمینی حقائق کو مدنظر رکھا اور جنگ احزاب میں اور حدیبیہ میں حکمت اور دانش کا کمال مظاہرہ کیا یعنی جب دیکھا کہ عرب کے سارے قبائل اکٹھے ہوکر مدینہ پر حملہ

آور ہو گئے ہیں تو مدینہ کے گرد خندق کھود کر محصور ہو گئے اور ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی۔ صلح حدیبیہ کا عمل تو احتیاط، دور اندیشی اور صبر و استقامت کی حیرت انگیز مثال ہے جس کے اثرات بڑے دور رس اور فیصلہ کن ثابت ہوئے۔

اس تناظر میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ ہم ہر اعتبار سے بہت کمزور ہیں اور ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہم واقعی بہت کمزور ہیں اور دشمن ہر لحاظ سے بہت طاقتور ہے اور وہ کسی بھی صورتحال میں یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو، اس لیے ہمیں بامر مجبوری یکطرفہ طور پر پیچھے ہٹ جانا چاہیے اور اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے۔ ایک چینی فلسفی کے بقول ''دشمن کی کمزوریوں سے زیادہ اگر اپنی کمزوریوں کا ادراک ہو تو آدھی جنگ آپ بغیر لڑے جیت سکتے ہیں اور شکست کا پہلا زینہ یہ سوچ ہوتی ہے کہ ہم کبھی غلط نہیں ہو سکتے اور جب تک آپ اس سوچ کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے تو ایک دن اسی کے نیچے دب جاتے ہیں۔''

اور بدقسمتی سے ہم یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ ہم نے بھی کچھ غلطیاں کی ہیں۔ خود احتسابی کی روایت ہمارے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلاشبہ ہمارے نظریات اور عقائد سو فیصد درست ہیں لیکن ہمارا طرز عمل غیر حقیقت پسندانہ ہے اور ہمارے رویوں پر چھچھوراپن غالب رہتا ہے۔ ''ماریں گے مر جائیں گے'' ہمارا ماٹو ہے اور کسی معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ، تحمل اور دور اندیشی کے ساتھ غور و فکر کرنا اور اس کے مطابق لائحہ عمل اختیار کرنا ہمیں آتا ہی نہیں ہے۔

میں نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی اور بظاہر بے حد قابل اعتراض کہ ہمیں اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے لیکن ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیجیے کہ فی زمانہ اس کے سوا چارہ کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ صورتحال کے حوالے سے ہم ''حالت مکی'' میں رہ رہے ہیں۔ دشمن طاقتور بھی ہیں اور بے رحم بھی جبکہ ہم دنیاوی اعتبار سے بہت کمزور ہیں اور اس ایمانی قوت سے محروم ہیں جو مکہ کے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ذرا رک کر اپنے اعمال کا احتساب کریں اور فرقہ پرستی کے جس جنون میں ہم مبتلا ہیں اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی تو ہم پرستی، علاقہ پرستی اور نسل پرستی کے تعصّبات میں گھرے ہوئے ہیں اور بے عملی کے جس مرض سے دو چار ہیں، اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر کریں۔ میرے نزدیک ہمارے زوال کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نقص عبادت کے مرض میں مبتلا ہیں یعنی مسلمان آبادی میں سے پندرہ بیس فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں اور نمازی حضرات کی نوے فیصد تعداد محض ٹکریں مارتی ہے اور معیار یا کوالٹی کی فکر نہیں کرتی گویا یہ نماز نہیں ہے بلکہ مقدس ورزش (Sacred Exercise) ہے پھر کردار بنے تو کیوں کر اور دعائیں قبول ہوں تو کیسے؟

چنانچہ میرے نزدیک اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم کچھ عرصے کے لیے سیاست سے تائب ہوجائیں اورراست فکر دینی جماعتیں صرف عوام کا تزکیہ کریں۔ یعنی معرفت الٰہی کی مہم چلائیں اور رجوع الی اللہ اور احساس آخرت کو فروغ دینے کی کوشش کریں علامہ اقبال نے بھی تو ایک موقع پر یہی نصیحت کی ہے۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو

ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

گویا ہمیں اب جدال وقتال کے ارادے ملتوی کر کے ساری توجہ جہاد بالقرآن پر مبذول کر دینی چاہئے کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے جہاد کبیر قرار دیا ہے۔ ترجمہ: ''گویا جب حالات سازگار نہ ہوں تو کفار کی اطاعت تو نہ کرو لیکن اس وقت قتال کی بجائے جہاد بالقرآن کا اسلوب اختیار کرلو۔'' (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت ۵۲)۔ جدید ترین علم کلام اختیار کر کے انہیں دلیل اور علم کے میدان میں شکست دو اور حقیقت یہ ہے کہ جہاد بالقرآن کے حوالے سے دنیا بھر میں جس قدر فضا آج سازگار ہے گزشتہ کئی صدیوں میں اس قدر سازگار نہیں تھی۔ جدید ترین سائنسی انکشافات اور عقلی دلائل نے قرآن پاک کی ایک ایک تعلیم کو اس طرح واضح کر دیا ہے کہ سلامت طبع رکھنے والا کوئی فرد اسے قبول کئے بغیر رہ نہیں سکتا جبکہ دیگر سارے مذاہب کوئی عقلی بنیاد نہیں رکھتے اور محض تعصّبات کے سہارے کھڑے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام ایک مضبوط تاریخی بنیاد رکھتا ہے، ہر حوالے سے وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور پیغمبر اسلام کی حیات مقدسہ اتنی پاکیزہ، اس قدر جامع اور فیوض و برکات کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہے اور آپ کے فرمودات میں اخلاق عامہ اور انسانی احترام کا اس قدر بھرپور پیغام ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند فرد ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ساری مشکلات اور نسلی مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوصف اسلام دنیا بھر میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے چنانچہ ۱۱/۹ کے حادثے سے پہلے امریکہ کی جیلوں میں روزانہ تقریباً دوسو افراد مسلمان ہو رہے تھے اور چند سالوں میں جرمنی میں تیس ہزار اور انگلینڈ میں پچاس ہزار خواتین اسلام قبول کر چکی ہیں اور پڑھا لکھا طبقہ بے اختیار اسلام کی طرف لپک رہا ہے۔ کوئی بیس سال پہلے مشہور عالم دین اور محقق و مفکر ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم فرانس سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ الحمرا لاہور میں انہوں نے ایک بڑی تقریب میں خطاب فرمایا تھا اور بتایا تھا کہ پیرس میں روزانہ دس افراد کی اوسط سے لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔

کم وبیش یہی صورتحال ہندوستان کی ہے۔ اگرچہ وہاں مسلمان خوف و ہراس کی فضا میں زندگی گزار رہے ہیں لیکن چونکہ ہندو مذہب کی بنیاد بت پرستی پر استوار ہے اور وہ سراسر توہمات کے سہارے کھڑا ہے جہاں عقل یا دلیل کا کوئی گزر نہیں اس لیے سوچنے سمجھنے والا پڑھا لکھا طبقہ اسلام کی طرف مائل ہو

رہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے پروگرام بڑے مقبول ہیں اور ان میں ہندو بھی خاصی تعداد میں شریک ہوتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ضلع مظفر نگر کے مولانا محمد کلیم صدیقی کے ہاتھ پر چند برسوں میں سینکڑوں ہندو اور سکھ بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔

میری نومسلموں کے بارے میں تین کتابیں ہیں۔ دو اردو میں اور ایک انگلش میں اور میرے پاس اس حوالے سے اتنا لوازمہ ہے کہ شاید دنیا کی کسی بڑی لائبریری میں یکجا نہ ہو۔ اپنی ان معلومات کے تناظر میں مجھے دنیا بھر میں ہندوستان اشاعت اسلام کے حوالے سے سب سے زرخیز ملک نظر آ رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نعروں، دعووں اور بڑھکوں کو ترک کر کے ہم حقیقت پسندی اختیار کریں اور ہر قیمت پر ہندوستان سے تعلقات کو نارمل کریں۔

میرے موقف کی دلیل یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی ساری ہی مشنری تنظیموں کی نظریں اس وقت ہندوستان پر لگی ہوئی ہیں۔ انہیں خوب اندازہ ہے کہ کوئی ذہین ہندو نوجوان علم اور عقل کے اس دور میں ہندو نہیں رہ سکتا۔ جب روس کی اشتراکی ایمپائر اپنے عروج پر تھی تو ہندو نوجوان کمیونسٹ ہو جاتے تھے۔ جب اشتراکیت کو زوال آیا اور اشتراکی سلطنت ختم ہوئی تو میں سوچتا تھا کہ اب بھارت کا ہندو نوجوان کدھر جائے گا۔ تب مجھے یہ جان کر بے حد تشویش ہوئی کہ ہندوستان میں ہر سال آٹھ لاکھ ہندو عیسائی ہو رہے ہیں اور چھ مشرقی ریاستوں میں یہ اکثریت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ کی ساری مشنری تنظیمیں کھربوں ڈالر لے کر ہندوستان میں آ کر بیٹھ گئی ہیں اور ہسپتالوں، تعلیمی اداروں، مختلف نوعیت کے وظائف اور رفاہ عامہ کے حوالے سے بڑی ہی سرگرم ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے پوپ پال نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور امریکی صدر کلنٹن بھی وہاں تشریف لائے تھے۔ اس طرح امریکہ اور دیگر یورپین ممالک ہندوستان کے نخرے اٹھا رہے ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ انہیں اس ملک میں عیسائیت کا مستقبل نہایت روشن نظر آ رہا ہے اور اگر متذکرہ بالا اخباری سروے رپورٹ درست ہے یعنی وہاں آٹھ لاکھ ہندو سالانہ عیسائی ہو رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پچاس سال میں ہندوستان عیسائی اکثریت کا ملک بن جائے گا اور امریکہ اور پورا یورپ سیاسی حوالے کے علاوہ مذہبی حوالے سے بھی اس کی پشت پر کھڑا ہوگا۔

اس لیے بے حد ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے خلاف دشمنی اور محاذ آرائی کا سلسلہ یکطرفہ طور پر ختم کر دیں اور بڑے سے بڑا نقصان اُٹھا کر اس کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کریں اور یہ تسلیم کر لیں کہ ہندوستان جغرافیے اور آبادی کے اعتبار ہی سے نہیں ہر حوالے سے ہم پر برتری رکھتا ہے۔ پھر جب دونوں ملکوں کے تعلقات نارمل ہوں گے اور دشمنی پس منظر میں چلی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ چند سالوں

میں انقلابی تبدیلی رونما ہوگی اور اگر اب آٹھ لاکھ ہندو عیسائی ہو رہے ہیں تو پھر اس کے مقابلے میں سالانہ بیس لاکھ ہندو مسلمان ہونے لگیں گے اور پچاس سال تک صورت حال میں انقلاب آ جائے گا۔

میں یورپ، امریکہ اور ہندوستان میں اسلام کی پیش رفت اور شدید ترین مشکلات کے اندر اس کی سخت جانی کو دیکھتا ہوں تو میری سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ساری مسیحی دنیا نے امریکہ کی قیادت میں عالم اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کیوں شروع کر رکھی ہے۔ دراصل صلیبی ذہنیت کے سارے عناصر بشمول یہودی مافیا سخت پریشان ہیں کہ اگر کسی مسلمان ملک میں اسلامی شریعت کا نظام حقیقی معنوں میں نافذ ہوگیا اور وہ چند سال بھی کامیابی سے چلتا رہا تو اس کے اثرات اور ثمرات کو دیکھ کر ساری دنیا کی توجہ ادھر ہو جائے گی۔ اس لیے وہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کا راستہ زبردستی روک رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہر طرح کی دھاندلی اور بے اصولی روا رکھے ہوئے ہیں۔

ان بہت ہی مشکل حالات میں ہمارے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ مغربی اقوام کو ہم چڑانے کی کوشش نہ کریں اور پرامن طور پر ایک طرف اپنے اندرون کی تطہیر کریں، اپنے اعمال اور رویوں کی اصلاح کریں اور داعی کا کردار ادا کریں۔ داعی کسی کا بھی دشمن نہیں ہوتا، سب کی بھلائی چاہتا ہے اور سب کو خیر کی طرف لانا چاہتا ہے اور پھر جب ہم دنیا کو حکمت اور دانش کے ساتھ دین حق کی دعوت دیں گے اور اس دعوت کے پیچھے ہمارا اخلاص کارفرما ہوگا اور ہمارا عمل ہمارے قول کی شہادت دے گا تو دنیا ہماری بات سنے گی اور ان شاء اللہ وہ موثر بھی ٹھہرے گی۔ قرآن کہتا ہے: ترجمہ: ''اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔'' (سورہ نحل آیت: ۱۲۵)

پھر کیا عجب ہمارے صبر، تقویٰ اور اخلاص کے نتیجے میں مغربی اقوام بھی اسی طرح مسلمان ہو جائیں جس طرح تاتاری مسلمان ہو گئے تھے۔ یاد رہے کہ تاتاریوں جیسی وحشی قوم ایک باعمل، متقی عالم دین کی حکمت اور صبر کے نتیجے میں مسلمان ہو گئی تھی اور مجھے اس طرح کے معجزات یورپ، امریکہ اور ہندوستان میں ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں فکر انگیز بات یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق غزوہ ہند بغیر اسلحے کے لڑا جائے گا یعنی مجاہدین اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے اور قلعوں کی دیواریں گرتی چلی جائیں گی۔ اس کی تعبیر بعض علماء نے یہ کی ہے کہ یہ جہاد سراسر دعوت کے حوالے سے ہوگا اور وہاں کی غیر مسلم آبادی قرآنی تعلیمات اور مسلمانوں کے حسنِ سلوک سے اس طرح متاثر ہوگی کہ کثیر تعداد میں، فوج در فوج مسلمان ہوتی چلی جائے گی جیسی قرون اولیٰ میں ہوئی تھی، جیسے شمالی افریقہ اور وسط ایشیا میں ہوئی تھی اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کا نقشہ ایک بار پھر منظر عام پر آ جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ ہم سچے داعی کا کردار اختیار کر لیں اور صبر و تقویٰ اور حکمت و موعظت کو اپنا شعار بنا لیں۔

اسلام اور مغرب

محمد ظفر اقبال☆

مادی ترقی کا لازمی نتیجہ ۔شناخت کا بحران
واہمہ یا حقیقت؟ (آخری قسط)

اسلامی دنیا: مادّی ترقی کا حصول مغربی مفکرین کے بیانات کی روشنی میں

یہ تو مادی ترقی کے حوالے سے اسلامی تہذیب کے علمی نمائندوں کے بیان فرمودہ خطوط اور مجوزہ احتیاطیں اور دوسرے طبقے کے خدشات، اعتراضات اور نتائج پر گفتگو تھی ـــــ اس مبحث کو اگر ایک اور زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو بات زیادہ واضح ہو سکے گی۔ اہل مغرب جن سے مادی ترقی کے حصول کے لیے استفادہ کیا جائے گا، خود وہ مسلمانوں کے اس طرز عمل کو کس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آیا وہ اس تعلیم و تحصیل کو بلا کسی شرط اور قید کے مسلمانوں تک منتقل کر دینے پر تیار ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان مغرب سے علوم وفنون سیکھ کر الگ ہو جائیں اور مغرب کو اس کی خبر بھی نہ ہو؟ یا انھیں مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں، عزائم، خواہشات، جذبات، احساسات کی پوری پوری خبر ہے اور وہ نہایت کڑی شرائط اور قیود کے ساتھ اہل اسلام کو مغربی علوم وفنون سے استفادے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند شواہد اور نظائر کا مطالعہ ضروری ہے۔

مغربی مفکرین کا متفقہ اعلان: مادی ترقی اور غرب زدگی لازم وملزوم

مرحوم ڈاکٹر محمود غازی [سابق صدر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد] اپنی آپ بیتی بیان فرماتے ہیں کہ:

> ''آج سے چند سال پہلے جرمنی میں ایک اجتماع میں جانے کا موقع ملا۔ میرے علاوہ باقی مفکرین یورپ سے بلائے گئے تھے۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: ''کیا اسلام مغرب اور یورپ کے لیے خطرہ ہے؟'' جس کے ایک سوال کے جواب میں میں نے اپنا تجزیہ پیش کیا کہ اب مسلمان مفکرین اور دانش وروں کی بڑی تعداد اس بات کی نمائندگی کرتی ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کی سائنس اور

☆ zafar.q.iqbal@gmail.com

ٹیکنالوجی، ان کی سہولتیں یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہونی چاہییں اور ان کو اپنانا چاہیے۔ جب کہ ان کے جو منفی پہلو ہیں مثلاً اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات و نظریات یا سیکولرازم اور لامذہبیت یا مرد وزن کی آزادی جوان کے یہاں ہے، یہ چیزیں دنیائے اسلام کو قبول نہیں کرنی چاہییں۔تو اس کے جواب میں اجتماع کے شرکا نے تقریباً بالاتفاق میری بات کو مسترد کر دیا اور کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اس رویّے کو درست سمجھتے ہوں، لیکن مغرب ان شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہ ہوگا۔انھوں نے کہا یہ ایک پورا پیکج ہے، جسے آپ کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا۔اس میں آپ کو اخذ وانتخاب[pick and choose] کی اجازت نہیں دیں گے''۔ [۱۲]

اگر اس سلسلے میں مستند مغربی مفکرین کے چند ایک بیانات بہ راہ راست پڑھ لیے جائیں تو بات زیادہ واضح اور مؤکد ہوجائے گی۔

معروف مغربی ماہر معاشیات اور مؤرخ ٹائن بی لکھتا ہے:

Possibly experience has already shown that this attempt to pick and choose [aimed at receiving from the West the maximum amount of Western technology while taking the minimum amount of the rest of our civilization] may not be practicable in the long run. If you once commit your self to taking one element from some alien civilization you may find yourself led on, in unexpected ways, into being constrained also to receive other elements which, at first sight, might seem to have no connection with the element that you have originally taken intentionally and deliberately. In the long run, it may not be possible to take a part and leave the rest; What that is ...... all non-western civilization have

been trying to do during the last two hundred years. They have been trying to take as much possible of our technology and as little as possible of the rest of our civilization.[۱۳]

معروف امریکی تجزیہ نگار اور مسلمانوں کے خلاف امریکی عسکری یلغار اور تہذیبی حملے کو جواز فراہم کرنے والا مفکر سیمویل ہن ٹنگٹن صاف لفظوں میں لکھتا ہے:

Only when Muslims explicitly accept the Western model will they be in a position to technicalize and then to develop.[۱۴]

ایک اور مغربی مفکر ہملٹن گب کی یہ حتمی رائے ہے کہ جدید کاری[modernization]اور غرب زدگی[westernization]دونوں لازم وملزوم ہیں۔ عالم اسلام کے درپیش مسائل کا واحد حل مغربی اقدار وتہذیب کوترقی اور ٹیکنالوجی کے ساتھ جوں کا توں اختیار کر لینے میں ہے۔[۱۵]

گب تصریح کرتا ہے کہ جن ممالک میں مغرب سے مستعار اور ماخوذ مادی ترقی اور صنعتی ترقی رواج پکڑ رہی ہے ان ملکوں کا بہ یک وقت مغربی تہذیب واقدار سے محفوظ رہنا اور اس کے بالمقابل اسلامی تہذیب، اقدار اور روایات سے اپنا تعلق استوار رکھنا امر محال ہے:

A wave of antipathy, if not contempt, for everything to do with Western civilization has to late become manifest in the Arab World ...... The plain truth of the matter that "moderenization" means "westernization". But on the other hand, it would be impossible for the Arabs [Muslims] to follow the path taken by the Turkish Republic without losing their identity completely. This, then, is the question: how in a world in which technology is making progress at a ever vaster scale, can the social values and cultural ideals of Islam be reaffirmed in

such a way as to rebuild a stable society endowed with vigorous and homogeneous social order capable of playing an active and constructive role.[۱۶]

مغرب: مادی ترقی کے نتیجے میں درپیش مسائل:

متذکرہ بیانات اور شواہد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کا حصول ترک واخذ کے اصول پر تو ممکن نہیں۔ کیا اب اس کی واحد متبادل صورت وہی رہ جاتی ہے جس کا مشورہ زوال کے تجزیے کے ضمن میں مسلم مفکرین کے پہلے طبقے نے دیا تھا؟ کیا اس بات کو نظرانداز کر دینا آسان ہے کہ مغرب نے اس ترقی کے حصول کی خاطر غیر شعوری طور پر ہی سہی اپنی تمام مذہبی [religious]، معاشرتی [social]، اخلاقی [moral] اور خاندانی [family] اقدار کو قربان کر دیا۔ زندگی اور معاشرے سے متذکرہ اوصاف کے انخلا نے مغرب کو مختلف النوع مسائل اور مشکلات سے دو چار کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی معاشرے کو خودغرضی [self -interestedness]، تشویش [anxiety]، دل شکستگی [despair] اور individuality جیسے اوصاف رذیلہ مادی ترقی کے ''تحفے'' کے طور پر عطا ہوئے ہیں۔ مغربی معاشرے کا انسان، انسانی تعلقات کی سلک میں منسلک نہیں بلکہ قانونی تعلقات کا اسیر بن کر رہ گیا ہے۔ دوسو سال تک مادیت اور ترقی کے دفاع کے باوجود اب مغرب میں خاندان اور مذہبی اخلاقیات کے احیا کی کوششیں شروع ہو رہی ہیں۔ ہائیڈگر جیسا فلسفی کہہ رہا ہے کہ مغربی تہذیب اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے۔ وہ جدید دنیا کے مسائل کے حل کے لیے the other thinking کا قائل ہو گیا تھا۔ Der spiegel نے جب ہائیڈگر سے سوال کیا کہ دنیا کیسے بدلی جا سکتی ہے تو اس نے کہا:

No! I know of no path toward a direct change of the present state of the world, assuming that such a change is at all humanly possible.[۱۷]

اسلامی دنیا: مادی ترقی کا حصول: چند سوالات اور حقائق:

مسلم مفکرین کے مختلف نقطہ ہائے نظر اور مغربی مفکرین کے بیانات کے مطالعے سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اس کو سامنے رکھ کر چند نتائج اور چند سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ بات ہر شبہے سے بالا ہے کہ امت مسلمہ کا مجموعی مزاج، چند مستثنیات کے ساتھ، یہی ہے کہ وہ اگرچہ مغرب جیسی

مادی ترقی کے خواہاں ہیں، لیکن دوسرے طرف من حیث الکل اب تک اپنے مذہبی، اخلاقی، تہذیبی اور روایتی اقدار سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں، ملٹن ویورسٹ[Milton Viorst] جیسے مغربی مفکرین جس بات کو''عربوں کی مقفل سوچ'' سے تعبیر کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ مسلمان اس دور میں بھی مذہب کو قابل عمل سمجھ رہے ہیں۔ [18] خواہشات اور جذبات کی حد تک یہ رویہ بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اسلام سے غیر مشروط وابستگی میں اب بہت حد تک تبدیلی آ گئی ہے، مذہب کی گرفت مسلم معاشرے سے بہ تدریج ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ جنوبی ایشیا کی تاریخ کا ماہر محقق فرانسس رابنسن [Francis Robinson]، گزشتہ سو سالوں میں مسلمان معاشروں میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کا تجزیہ کرتے ہوئے، اسے ٹھیک وہی راستہ قرار دیتا ہے جس پر چل کر عیسائیت نے سیکولرازم کی راہ اپنائی تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ اب مسلم معاشروں میں بھی سماجی و معاشرتی قوانین کے لیے وحی کی رہ نمائی کو بالعموم عوامی زندگی میں لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا، مذہبی علم کو ارزاں باور کیا جاتا ہے، وہ لوگ جو تہذیبی سطح پر مسلمان تھے، عملی طور پر مکمل ''عقلی'' ہوگئے ہیں۔ سیکولرازم تک لے جانے والا یہی وہ راستہ ہے جو مسلمانوں سے قبل عیسائیت اختیار کر چکی تھی۔ رابنسن لکھتا ہے:

> For the hundered years Preceding the Muslim revival of the late twentieth century, the Islamic World seemed to be following a path of secularization similar to that on which the Western Christian world embarked some centuries before. Law derived from revelation had been increasingly removed from public life; religious knowledge had steadily lost ground in education; more and more Muslims who were Islamic by Culture but made 'rational' calculations about their lives -- in much the same way as Christians formed in the secular West might to do -- had come forward.[19]

کیا کوئی قوم آزادی[freedom] اور ترقی[progress] کو بہ طور قدر[value] اختیار کر لینے کے بعد مذہب[خصوصاً اسلام] سے اپنا رشتہ برقرار رکھ سکتی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ

اسلام کا تصور بندگی آزادی کو سلب کر لیتا ہے اور ترقی کا مغربی ماڈل دنیا کو دارالامتحان ماننے کے انکار اور Kingdom of Heaven کے اصرار پر قائم ہے؟ ـــ یہ مبحث انتہائی غور و تدبر کا متقاضی ہے۔ کیا اس کے جواب میں، تمام خطرات و مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے، جذبات میں آکر فقط اتنا کہہ دینا کافی ہو جائے گا کہ ''مضمون نگار مسلمانوں کو فقر و افلاس میں دھکیلنے کے متمنی اور پتھر کے زمانے میں بھیج دینے کے خواہاں ہیں''؟ ـــ اس وقت مسلم امہ کا اپنی مجموعی دانش سے یہ سوال ہے کہ کیا مسلم تہذیب اس بات کی متحمل ہو سکتی ہے کہ وہ ترقی کی خاطر اپنی اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کو قربان کر دے؟ کیا مغرب کے لیے اصل خطرہ [threat] مذہب سے غیر مشروط وابستگی میں پنہاں نہیں ہے؟ یہ بات قابل غور ہے کہ مسلمان مغرب سے ترقی کی تحصیل کے بعد مغرب ہی کے لیے ترقی کے میدان میں خطرہ بن جائیں، کیا یہ بات فی الواقع اتنی ہی سادہ ہے؟ جب مسلمان، اپنے زعم میں، ترقی کی دوڑ میں مغرب سے آگے بڑھ رہے ہوں گے تو مغرب سو رہا ہوگا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خطرہ تو اس وقت ہوگا جب دو بنیادی مابعد الطبیعی تصورات [''خدا مرکزی'' اور ''انسان مرکزی''] کے مابین معرکہ آرائی الحق اور الخیر کی سطح پر ہو؟ کیا ترقی کے مغربی ماڈل کو اختیار کر لینے کے بعد مسلمانوں کے لیے بدیہی طور پر وہی طرز زندگی پر کشش اور بامعنی نہیں ہوگا جو ترقی کا لازمہ ہے اور جس کا عملی اظہار مغرب میں ہو رہا ہے؟ اس صورت حال میں تصادم یا ٹکراؤ کا کیا سوال؟ یہاں تو اصل جنگ مادی میدان میں مسابقت [competition] سے عبارت ہے۔ جو جتنا اچھا صارف [consumer] اور آزاد مارکیٹ کی معیشت [free market economy] کو فروغ دینے والا ہوگا وہ زیادہ طاقت ور کہلائے گا۔ کیا یہاں خدا سپردگی، خود فراموشی، توکل، غیبی مدد وغیرہ مضحکہ خیز تصورات معلوم نہیں ہوں گے؟ کیا یہاں اصل پیمانہ، قدر، فرقان، برہان، حق، خیر اور سچ صرف اور صرف سرمایہ [capital] نہیں ہوگا؟ کیا فکری اور نظریاتی سطح کی یہ تبدیلی مسلمانوں کو اس قابل چھوڑے گی کہ وہ اسلام کو اس کی اصل صورت اور تعبیر کے ساتھ دنیا میں پورے تحکم اور قوت کے ساتھ غالب اور نافذ کرنے کی کوشش کر سکیں؟ کیا ترقی کا یہ ماڈل غیر اقداری [value neutral] ہے؟ کیا یہ اقدار ایک علیحدہ تہذیب اور اسلوب حیات کی داعی نہیں ہیں؟ کیا ہمارا مضبوط اسلامی اقداری اور خاندانی نظام اس مزعومہ ترقی کے بعد قائم رہ سکے گا؟ کیا ہمارے پاس مغرب کی طرح ایسے ادارے [institutions] موجود ہیں جو اخلاقی طور پر بدعنوان اور بگڑے ہوئے معاشرے کو سہارا دے سکیں؟ ہمارا آخری فعال ادارہ جواب تک بہت مضبوط ہے: خاندانی نظام ـــ کیا وہ اس progress اور development کی خاطر پاش پاش نہیں ہو جائے گا؟

ترقی اور اسلام: مجموعی مسلم دانش کا ذہنی خلجان:

یہ چند اہم اور قابل غور سوالات ہیں۔ ان سوالات کو جذبات کی سطح پر نہیں مسائل اور درپیش صورت حال کی تفہیم کی غرض سے واقعیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ امت مسلمہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ pre-industrial عہد میں جیتے ہوئے post-industrial معاشرے کے مسائل اور مصائب سے آگہی اور واقفیت رکھتی ہے۔ ان سوالات و اشکالات سے قطع نظر یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ صنعتی انقلاب نے مسلم دانش ورانہ ذہن کو مجموعی طور پر تشکیک کا خوگر بنا دیا ہے۔ آج کا دانش ور ذہناً مفلوج معلوم ہوتا ہے۔ اسے اسلام اور ترقی کے مابین تطبیق و تلفیق کی کوئی تسلی بخش راہ نہیں مل رہی۔ یا غالباً ان میں تطبیق کے عدم امکان نے مسلمانوں کو دانش ورانہ سطح پر ''کیا ہو رہا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیے'' کے درمیان stuck کر دیا ہے۔ ماریہ سبرٹ کا ترقی کے خواہاں تیسری دنیا کے لوگوں کو دیا گیا مشورہ بہت اہم اور قابل توجہ ہے کہ:

> The third world had to develop first before even think about REAL PROGRESS.[۲۰]

اس سلسلے میں مغربی مابعد الطبیعیات و علمیات اور بلا تاویل اسلامی حقائق و نکات پر مسلسل اور سنجیدہ غور و فکر کے بعد امید ہے کسی ایسے نتیجے تک پہنچا جا سکے جو رومانویت اور جذباتیت سے زیادہ حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہو۔

حواشی

۱۲- محمود احمد غازی، ''مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج اور علما کی ذمے داریاں''، مشمولہ ماہنامہ الشریعہ، مارچ ۲۰۰۵ء، صفحہ ۱۲۔

13-Arnold J. Toynbee, *Christianity Among the Religions of the World,* New York: Charles Scribner's Sons., 1957, p. 51.

ٹائن بی نے اپنی بعض دیگر تصانیف میں بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Arnold J. Toynbee, *The World and the West,* New York:

Oxford University Press, 1954, pp. 66-84, pp. 99-100.

Arnold J. Toynbee, *Idem, Civilization on Trial,* New York: Oxford University Press, 1949, pp. 184-212.

14-Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilization and the Remarking of World Order,* Penguine Books, 1997, p. 74.

۱۵- ملاحظہ کیجیے:

Hamilton Gibb, *Modern Trends in Islam,* Chicago: Chicago University Press, 1972.

16-Hamilton A.R. Gibb, *Studies on The Civilization of Islam,* Lahore: Islamic Book Services, 1987, p. 331.

17-"Spiegel Interview with Martin Heidegger, " in *Martin Heidegger and National Socialism: Questions and Answers,* eds. Günther Neske and Emil Kettering, trans. Harries Lisa, New York: Paragon House, 1990, p. 60.

۱۸- تفصیل کے لیے دیکھیے:

Milton Viorst, "The Shackles on the Arab Mind", *The Washington Quaterly*, Spring 1998, Vol. 2, pp. 168-175.

19-Francis Robinson, "Secularization, Weber and Islam", in *Islam and Muslim History in South Asia,* Delhi: Oxford University Press, 2010, p. 122.

20-José Maria Sbert, op.cit., p. 195.

تبصرہ کتب

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ☆

مطالعۂ قرآن برائے طلبہ وطالبات

'دی علم فاؤنڈیشن' ایک ٹرسٹ ہے جو گزشتہ تین چار برس سے خاص طور پر اسکولوں میں بچوں کو قرآن مجید کے معانی ومفاہیم سے روشناس کرانے کے لیے محنت کر رہا ہے۔ فاؤنڈیشن نے اسکولز کے طلبہ وطالبات کے لیے سات حصوں پر مشتمل ایک نصاب ترتیب دینا شروع کیا ہے، جس کے چار حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ یہ نصاب اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ تیسری سے آٹھویں کلاس تک کے بچوں کو ایک ترتیب سے پورے قرآن مجید کے آسان فہم ترجمہ اور مختصر تشریح سے اس طرح گزار دیا جائے کہ آئندہ زندگی میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے وہ کسی ترجمہ کی مدد کے بغیر اس کا معنی ومفہوم سمجھ سکیں۔ یہ نصاب اس وقت ایک سو سے زائد اسکولوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر نیوی اور فضائیہ کے اسکولوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے اسے اپنے ہاں بطور نصاب مقرر کیا ہے۔

راقم نے اس نصاب کے پہلے حصے کا مطالعہ کیا ہے اور اسے بہت ہی مفید پایا ہے۔ ترجمہ آسان فہم ہے اور کلرز میں دیا گیا ہے، تاکہ بچوں کو یاد کرنے میں آسانی رہے اور ان کی توجہ برقرار رہے۔ اسی طرح نصاب کی تیاری میں بچوں کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھا گیا ہے' جیسا کہ پہلے حصے کا آغاز انبیاء کرامؑ کے واقعات سے کیا گیا ہے، کیونکہ چھوٹی کلاسز کے بچے کہانی سننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ کے مبعوث ہونے کی سرزمین اور متعلقہ اقوام کے بارے میں بتانے کے لیے رنگین نقشے بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں جو واقعات میں بچوں کی دلچسپی مزید بڑھا دیتے ہیں۔ کتاب کے ایک حصے کو چھوٹے چھوٹے اسباق میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر سبق سے پہلے اس کے بارے میں ایک تعارفی مضمون ہے، اس کے بعد آیات اور ان کا ترجمہ دیا گیا۔ اس نصاب کی سب سے دلچسپ چیز مجھے اس کی رنگین مشقیں لگیں جو بچوں کو قرآن مجید کی تعلیمات ذہن نشین کروانے میں بہت مدد ومعاون ثابت ہوں گی۔ اس کا اندازہ مجھے اس سے بھی ہوا کہ اس کتاب کا پہلا حصہ جب میں نے مطالعہ کے لیے گھر لا کر رکھا تو ایک آدھ دن ہی گزرا تھا کہ دیکھا کہ بڑا بیٹا عبداللہ بن زبیر، جس کی عمر ۸ سال ہے، اس کے اسباق کی دی ہوئی مشقیں از خود حل کر

رہا تھا اور اپنی اس ایکٹوٹی کو انجوائے بھی کر رہا تھا۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر علوم اسلامیہ Comsats، لاہور

کتاب کے ہر حصے کے ساتھ استاد کے لیے علیحدہ سے گائیڈ بک بھی موجود ہے، جس میں مشقوں کے جوابات کے علاوہ کتاب کی تدریس کی ہدایات بھی تفصیل سے درج ہیں۔ ترجمہ کے بیان میں مسلکی اختلافات کے بیان سے گریز کیا گیا ہے اور متفق علیہ مفاہیم اور موضوعات کو مقصود بنایا گیا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیم ہر مسلمان کے لیے حتی الامکان فرض ہے۔ راقم ہر اسکول کے لیے اس کتاب کو بطور نصاب مقرر کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے، یا کم ازکم یہ تو ہونا ہی چاہیے کہ ہر اسکول اس کتاب کا ایک سیمپل حاصل کر کے اسے نصاب میں داخل کرنے کے بارے میں غور وفکر کرے۔ علاوہ ازیں والدین ان کتب کے ذریعے اپنے گھروں میں ۸ سے ۱۴ سال کے بچوں کو نہ صرف ترجمہ قرآن کی تعلیم دے سکتے ہیں بلکہ قرآن مجید کے بارے میں اپنی معلومات میں بھی بہت حد تک اضافہ کر سکتے ہیں۔

نصاب بہت ہی آسان فہم انداز میں ترتیب دیا گیا ہے اور اس کی درس وتدریس کے لیے عالم فاضل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ کوئی علم تفسیر نہیں، بلکہ قرآن مجید کی ترجمانی اور معنی ومفہوم کا مطالعہ ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے اس نصاب کی کتب اسکولز کو بلاقیمت مہیا کی جاتی ہیں۔ خواہش مند حضرات وخواتین درج ذیل پتہ، ای میل یا ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کر کے منگوا سکتے ہیں:

Address: The Ilm Foundation, 3/63, Block No.3, D.M.C.H. Society, Karachi,74800, Pakistan
Email:info@tif.edu.pk; tif1430@gmail.com
Ph: +92-021-34304450-51

(بشکریہ ندائے خلافت)

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.................. پتہ..................

فون

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

قارئین البرہان کے نام

① جن اصحاب نے ایک دفعہ سالانہ چندہ بھجوایا جو ختم ہو گیا لیکن پرچہ اب بھی ان کو مل رہا ہے۔ وہ اگلے سال کے لیے زراعانت بھجوادیں یا ہو سکے تو تاحیات خریدار بن جائیں۔

② اگر آپ کے پاس پرچہ اعزازی آتا ہے اور آپ کو پسند ہے اور آپ مالی وسعت رکھتے ہیں تو ۴۰۰ روپے سالانہ زراعانت اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہیں، بھجوادیجیے تاکہ انتظامیہ پر مالی بوجھ کم ہو۔

③ اگر آپ خوشحال ہیں اور پرچہ آپ کو پسند ہے تو ۵۰۰۰ روپے بھجوا کر تاحیات خریدار بن جائیں۔ اگر آپ کاروبار، تجارت یا مارکٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں تو البرہان کو اشتہار دیجیے یا دلوایئے۔

④ اگر پرچہ آپ کو اعزازی طور پر ملتا ہے اور آپ کی دلچسپی اور پسند کا نہیں تو ازراہ نوازش خط، SMS، ای میل یا فون کے ذریعے مطلع فرمادیں تاکہ اس کی ترسیل بند کر دی جائے۔

⑤ اگر آپ مالی طور پر کمزور ہیں لیکن البرہان پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مطلع کیجیے، ہم پرچہ آپ کے نام جاری کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ ۴۰۰ روپے سالانہ ادا کر سکتے ہیں تو پرچہ فری نہ منگوایئے، خرید کر پڑھیے۔

⑥ البرہان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹایئے، خود خرید کر پڑھیے، دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دیجیے، دوسروں کو خرید کر دیجیے۔ اس کی ایجنسی لیجیے۔ اس کے تاحیات خریدار بنیے۔

⑦ مدیر البرہان کی کتابیں بلا معاوضہ مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے۔ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اتنی مالی سکت نہیں رکھتا کہ کتابیں طبع اور تقسیم کرے۔ ہم قارئین کی سہولت اور اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے صرف اتنا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی جو کتابیں مختلف پبلشرز نے طبع کی ہیں، وہ خرید کر طلب کرنے والوں کو بھجوادیتے ہیں۔ اگر آپ کو ٹرسٹ کے مقاصد سے دلچسپی ہے

تو کتابوں کی طباعت و تقسیم میں ادارے سے مالی تعاون فرمایئے۔

عبدالمجید

(سرکولیشن مینجر)